ISSN 0974-7346

اگست ۲۰۲۶ء

جلد ۲۱۳ ـــــ عدد ۸

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اور نشریاتی کام میں مدد کے لیے اس اکاؤنٹ پر تعاون کریں:

بینک کا نام: Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر: 4761005500000051

آئی ایف ایس سی: PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔ اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیر ممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437

Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ | ماہ صفر المظفر ۱۴۴۸ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۲۶ء | عدد ۸

مجلس ادارت

پروفیسر ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:

ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مقالات		
قرآن میں سائنسی اشارے اور پیشین گوئیاں	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۷
کلامِ شیخ العالم: توحید و سنت کی روشنی میں کشمیری معاشرے کی اصلاح	اشتیاق احمد وگے	۱۲
علامہ فراہیؒ کی زاہدانہ عربی شاعری	ڈاکٹر ابوذر ندوی	۲۹
نعوت و مناقب میں ہندوستانی زبانوں کا استعمال	ڈاکٹر محمد احمد نعیمی، ڈاکٹر سید محمد فضل الرحمن	۳۹
تحفۃ المجاہدین: ملیبار کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ	ڈاکٹر صالح امین ندوی	۵۱
باب التقریظ والانتقاد		
قرآنی استعارے	کلیم صفات اصلاحی	۶۴
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص اصلاحی	۷۱
ادبیات		
نعت	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۸۰
غزل	وارث ریاضی	۸۱
رسید کتب موصولہ		۸۲

شذرات

جولائی کا مہینہ، باران رحمت کی فراوانی کا زمانہ ہے۔ خدا کی کھیتی کے ہری ہونے اور سیر اب ہونے سے چشم و دل روشن و شاد ہوتے ہیں، تاحد نظر سبز مناظر، مردنی اور زندگانی کی حکمتوں کے راز فاش کرتے نظر آتے ہیں اور فکر و نظر قدرت کی اس فرمائش کو پورا کرنے کا بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ رحمت الٰہی کے آثار و علامات کو چشم بینا سے دیکھا جائے کہ زمین کے بے جان ہونے کے بعد رب رحیم کس طرح اس کو زندگی کی نعمت عطا کرتا ہے اور اس عمل سے اس حقیقت ازلی و ابدی کو پیش نظر لاتا ہے کہ انسان بھی مر کر یوں ہی زندگی کی نعمت سے دوبارہ ہم کنار کیا جائے گا۔
مرنا اور مر کر پھر زندہ ہونا، ایسا عمل ہے جو ایک نہایت قوت و قدرت والی ذات کے منطقی وجود کا اثبات ہے۔ جو صرف فرد ہی نہیں قوموں اور ملتوں کے بننے اور مٹنے اور مٹ کر پھر بننے کے مسلسل عمل کی سچائی بھی عیاں کرتا ہے۔

***

دنیا جہاں اور خاص طور پر ملک عزیز بھی ایک مدت سے اسی سچائی کا شاہد بنتا رہا ہے۔ جہاں ایک خاص نظریہ نے قوت کے زور، اکثریت کے جبر، دولت کے غرور اور زبان کے جھوٹ اور ذہن کی سازش کے بل پر فطرت کے ازلی حدود سے تجاوز کرنے کو قومی فخر بنا دینے میں اپنی ہنر مندی کا سامان سمجھ رکھا ہے۔ برسوں سے حالات نے یہی ظاہر کیا کہ خدا کی کھیتی خشک اور بنجر اور خدا کی بستی ویران اور کھنڈر ہوتی جاتی ہے۔ قانون، اخلاق، معاشرت، معاملات اور ملک کے دستور کی اہمیت، یہ سب ایک جماعت اور ایک فرد اور ایک نظریہ کے جذبۂ انانیت کے اسیر سے ہو گئے۔ خود نمائی بذات خود ایک بڑا عیب ہے لیکن خود رائی اس سے کہیں زیادہ تباہ کن مرض ہے۔ اس موقع پر وہ اقوال یاد آتے ہیں جن میں کہا گیا کہ تاریخ کا سفر ہمیشہ سیدھی لکیر میں نہیں ہوتا، جمہوریت کی لہر کے پیچھے پسپائی کی لہر بھی ایک سچائی ہے۔ ہنٹنگٹن کی ایک کتاب بہت مشہور ہوئی جس نے بتایا کہ جب جمہوری ادارے، عوامی توقعات پر پورے نہیں اترتے تو معاشرہ دوبارہ آمریت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ پھر انتخابی آمریت کا ظہور ہوتا ہے جو اصلاً جمہوریت کے بدن پر اگنے والا وہ سرطان ہوتا ہے جو خود جمہوریت کے خلیوں سے غذا حاصل کرتا ہے۔ ہندوستان میں قوم پرستی اور مذہبی احیائیت کے جراثیم نے آئین، عدلیہ اور ذرائع ابلاغ کی اخلاقیات کو جس طرح مسموم کیا اس کے بعد نظریاتی زوال کی منزل کو سامنے آنا ہی تھا۔ جس کی دوسری پہچان آمریت بشکل جمہوریت ہے اور اس کا سب سے بڑا ذریعۂ نفاذ، قانون کے حوالے سے ممکن ہوتا ہے۔ وہ قانون جو انصاف کی فراہمی کا ذریعہ نہیں بلکہ حکمراں کے ارادے کی تکمیل کا آلہ بن جاتا ہے۔

***

گزشتہ دنوں قومی مصائب ورذائل میں چندہ چڑھاواچوری، باوقاراور بلند درجہ مقابلہ کے امتحانات میں رشوت خوری اورمنظم بے ضابطگی، حزب مخالف کی سربازار خرید وفروخت اور نیلامی نے بظاہر خشک اور بنجر ہوتی ملک کی اخلاقیات پرحبس اور امس کی گھٹن بھری فضامیں بادوباراں اوررعدوبرق کے موسم کی آہٹ محسوس کی۔ اس موسم میں ان بادلوں کا بھی شاید کچھ دخل ہے جوایک بے بس قوم کی آہوں کا اثر سمجھا جاسکتا ہے۔ مسجدوں، درگاہوں، مزاروں اور مدرسوں کو زمین دوز کرنے کی لذت ایک نشے کی لت میں اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک نہایت عالیشان تعلیم گاہ محمد علی جوہر یونی ورسٹی کی عمارتوں کوڈھانے کی نوبت آگئی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کے سب سے بڑے مجاہد کے نام کا بھی کچھ پاس ولحاظ نہیں کیا گیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی سچائی سامنے آگئی۔ ابرہہ ہے تو طیراًابابیل کا وجود بھی اسی طرح برحق ہے۔ جس طرح مردہ زمین کی زندگی۔کیف یحیی الارض بعدموتھامیں نئے موسموں کی خوش خبری بھی دیکھا چاہیے۔

***

ایک خبرخوش اثرضرور آئی کہ دارالمصنفین کے ناظم اور معارف کے مدیراعلیٰ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں کو ملک کے ایک نہایت موقراعزاز شاہ ولی اللہ ایوارڈسے نوازا گیا۔ اس اعزاز کااعزاز بڑھانے والے ان سے پہلے پانچ اہل علم وفضل اور بھی ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کی ذات والا صفات سے وابستہ شخصیت ہو، جماعت ہو، نظریہ ہو، روایت ہو وہ وقارواعتبار کے درجہ کمال پرفائزہونے کا حق حاصل کرلیتی ہے۔ دہلی میں مولانا عطاء الرحمن قاسمی، عرصے سے علوم شاہ کے محافظ وامین بنے ہوئے ہیں۔ان کا ادارہ شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے بڑی تندہی، مستقل مزاجی اور خاموشی سے شاہ صاحب کے علوم کی اشاعت اور اس کے افادۂ عام کے ادائے فریضہ میں سرگرم عمل ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کا سب سے عظیم کارنامہ شاہ صاحب کے تمام نادرونایاب عربی وفارسی رسائل وکتب کے دستیاب اردوترجموں کو مجموعہ رسائل شاہ ولی اللہ کے نام سے شایع کرنا ہے۔ ان مجموعہ ہائے رسائل کی اشاعتوں کو مولانا قاسمی نے یادگارعلمی تقریبات کی روایت میں بدل دیا، مختلف مشاہیر مثلاً سابق صدر جمہوریہ عبدالکلام نے بھی اس کی ایک تقریب اجرامیں شرکت کی۔ ۳۰جون کو ایک ایسی تقریب 'مجموعہ ہائے رسائل شاہ ولی اللہ' کے تعلق سے منعقد ہوئی۔ اس انعقاد میں انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ غالب انسٹی ٹیوٹ نے بھی شرکت کی۔ تقریب میں سلسلۂ مجموعۂ شاہ کی دسویں جلد کا اجراء بھی تھا۔ اس موقع پر ناظم دارالمصنفین کی قرآنی خدمات خصوصاً ان کے انگریزی ترجمہ قرآن کا حوالہ دیا گیا کہ علوم قرآنی کی خدمت کا سلسلہ حضرت شاہ صاحب سے جاملتا ہے۔ اس تقریب میں ملک کے ممتاز علماء اور دانشوروں نے

حضرت شاہ دہلوی کی شان اور علوئے مرتبت کے اعتراف کے ساتھ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں صاحب کے اعزاز میں شرکت کی۔ تقریب کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیرمین پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کی۔ معارف اس کامیاب علمی تقریب کے لیے مولانا عطاء الرحمن قاسمی کو خاص طور پر دل سے مبارکباد پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

***

۳۰/ جون کے اخبار سے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاذ تفسیر وحدیث، متعدد علمی و تحقیقی کتابوں کے مصنف، مقبول خطیب اور کئی اداروں کے سربراہ وسرپرست مولانا سید سلمان حسینی ندوی کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ ملیح آباد میں ان کے قائم کردہ تعلیمی ادارے جامعہ سید احمد شہید میں تدفین عمل میں آئی۔ عمر قریب بہتر سال کی پائی۔ یہ ساری زندگی پر شور ہی رہی۔ ان کی علمی زندگی کا آغاز ایک شاندار مستقبل کی تصویر بن گیا تھا۔ اردو اور اس سے زیادہ عربی زبان میں ان کی طلاقت لسانی کا شہرہ دور دور تک ہوا۔ ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین میں اسلام اور مستشرقین سمینار میں ان کی خطابت کی دھوم رہی، برجستہ اردو سے عربی اور عربی سے اردو میں ترجمانی کی ان کی صلاحیت کی داد، اس وقت کے ناظم دارالمصنفین سید صباح الدین عبدالرحمن نے یہ لکھ کر دی کہ ندوہ کے کم سن استاذ مولوی سلمان ندوی کا غضب کا اٹھان ہے۔ اجتماع کے سارے حاضرین متحیر تھے، وہ بلبل شیوہ بیان کی طرح مذاکرہ میں چہچہاتے رہے۔

دوسری اندوہ ناک خبر، اعظم گڑھ کے ایک علمی خاندان کی یادگار عالم بدیع اعظمی کی رحلت کی ہے۔ جن کا انتقال قریب نوے سال کی عمر میں ۲۲/ جولائی کو ایک طویل علالت کے بعد ہوا۔ نوجوانی ہی سے وہ عملی سیاست سے وابستہ ہوئے، خاص طور پر مسلم سیاست کو انہوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا، ڈاکٹر فریدی سے تعلق اور مسلم مجلس میں ان کی موجودگی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی، آخر میں وہ ملائم سنگھ یادو اور ان کی سماج وادی پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ اعظم گڑھ کے نظام آباد کے حلقہ اسمبلی سے وہ مسلسل پانچ بار منتخب ہوئے اور تادم حیات ممبر رہے۔ اس مقبولیت میں سب سے بڑی وجہ ان کی فقیرانہ زندگی، حد درجہ سادگی اور عہدہ و منصب سے دوری رہی۔ معارف کے وہ مستقل خریدار ہی نہیں بے تاب قاری بھی تھے۔ کثرت مطالعہ میں شاید ہی ملک میں کوئی دوسرا اسمبلی وپارلیمنٹ کا ممبر ان جیسا ہو۔ دارالمصنفین سے قلبی تعلق تھا۔ وہ اکثر کتب خانے آتے اور کتابوں کے ساتھ یہاں کے حالات کی بھی خبر رکھتے۔ ایسا بے نیاز، علم نواز اور زاہدانہ طبیعت کا سیاست داں اور خطیب، ہندوستانی سیاست میں اور کم از کم دور حاضر میں شاید ہی کوئی اور ہو۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ دونوں مرحومین کے جنازہ میں ایک خلقت امنڈ پڑی۔

***

قرآن میں سائنسی اشارے اور پیشین گوئیاں[1]

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

قرآن پاک سائنس اور ٹکنالوجی کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ ساری انسانیت کے لیے رہتی دنیا تک ہدایت کا وسیلہ ہے۔ اس کے ذریعے انسان اس دنیا میں امن و سکون کی زندگی گزارتا ہے اور آخرت میں سرخرو ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کتاب کا منبع وہی ذات الٰہی ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا، اس کا دقیق نظام بنایا اور ہر چیز انتہائی مناسبت، توازن اور تناسب سے بنائی، اس لئے اس ذات الٰہیہ نے کہیں کہیں کائنات کے کچھ حقائق بھی اس آخری کتاب الٰہی میں بیان کر دیے ہیں جو اس کی متناہی عظمت اور بندوں کے تئیں شفقت و رحمت کو اجاگر کرتے ہیں۔ قرآن پاک اگرچہ انسان کی زندگی کے ہر موڑ کے لیے ہدایت ہے، لیکن اس میں ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں ایسی معلومات بھی پیوستہ ہیں جو صدیوں بعد انسانوں کو معلوم ہوئیں اور آج بھی ان کے انکشاف کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ بھی اس لحاظ سے قرآنی اعجاز کا ایک حصہ ہے۔

یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ سائنسی نظریات نئے نئے انکشافات اور مشاہدات کی روشنی میں بدلتے رہتے ہیں البتہ دنیا اور کائنات کے حقائق اٹل ہیں۔ ان حقائق کا انکشاف اور ان کو سمجھنے کا عمل مسلسل جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ یہ بات پوری طرح ممکن ہے کہ ہم قرآن پاک کے اس طرح کے بعض بیانات کو اپنی محدود معلومات کی وجہ سے ابھی تک نہیں سمجھ پائے ہیں لیکن مستقبل میں ہونے والے انکشافات کی روشنی میں ہم ان کو بھی سمجھ پائیں گے۔

عبد القاہر الجرجانی (م: ۴۷۱ھ/۱۰۷۹ء) کی "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغۃ" اور ابو بکر الباقلانی (م: ۴۰۲ھ/۱۰۱۳ء) کی "اعجاز القرآن" جیسی سیکڑوں کتابیں ہیں جن میں قرآن

[1] یہ مضمون، مضمون نگار کے انگریزی ترجمۂ قرآن (*The Glorious Quran,* Pharos, Delhi, 3rd edition, 2025, pp. 31-33) سے ماخوذ ہے (انگریزی سے ترجمہ: عدیل اختر)۔

کے لسانی اعجاز، فصاحت بیان اور ادبی نوعیت پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ کی دہائی کے وسط سے ایسی کتابیں بھی سامنے آنے لگیں جن میں قرآن پاک کے اندر موجود سائنسی اشاروں کو اجاگر کیا گیا ہے جو اس کے الٰہی و آسمانی کتاب ہونے کا ایک اور ثبوت ہے۔[۲]

قرآن پاک کائنات اور انسان کی تخلیق کے منصوبے و مقصد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی دینے والی کتاب ہے جو یہ بتاتی ہے کہ انسانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے اور زمین پر اپنی زندگی کیسے گزارنی چاہیے۔ وہ انسانوں کو خبر دار کرتی ہے کہ آخرت میں ان کی زندگی کا فیصلہ زمین پر ان کے طرز عمل کے مطابق ہی ہوگا۔ تاہم قرآن موقع بہ موقع کچھ پیشین گوئیاں، سائنسی حقائق اور کچھ ایسے حقائق کی طرف بھی اشارے کرتا ہے جو قرآن کے نزول کے وقت جزیرۂ عرب کے لوگوں کو، یہاں تک کہ تمام نوع انسانی کو بھی بالعموم معلوم نہیں تھے۔ قرآن پاک میں اب بھی ایسی بہت سی سائنسی علامتیں موجود ہو سکتی ہیں جن کو آنے والی نسلیں دریافت کرتی رہیں گی۔

ذیل میں قرآن پاک کے صرف کچھ سائنسی اشاروں اور پیشین گوئیوں کا ایک بہت مختصر خلاصہ پیش کیا جارہا ہے:

۱۔ کائنات اپنی ابتداء میں ایک جمے ہوئے تودے کے مانند تھی اور وہ اپنی پیدائش سے اب تک مسلسل پھیلتی جارہی ہے: اللہ تعالیٰ نے جب کائنات کو تخلیق کیا تو یہ ایک وسیع و عریض

---

(۲) مثال کے طور پر: وحید الدین خاں، علم جدید کا چیلنج، لکھنؤ ۱۹۶۶ (عربی میں الاسلام یتحدی، کویت ۱۹۶۹، اور انگریزی میں *God Arises*، دہلی ۱۹۸۷)؛ زغلول النجار، من آیات الاعجاز العلمی فی القرآن، قاہرہ ۲۰۰۴؛ عبدالمجید الزندانی، توحید الخالق، موسوعۃ الاعجاز العلمی فی القرآن والسنۃ، ب.ت. (net.55a.net)؛ علی محمد الصلابی، المعجزۃ الخالدۃ–الاعجاز العلمی فی القرآن الکریم، بیروت، ۲۰۱۳ء؛ موریس بوکای Maurice Bucaille, *La Bible, Le Coran et La Science* پیرس ۱۹۷۶ (انگریزی ترجمہ Alaistair D. Pannell, *The Bible, The Quran and Science* جو مختلف ایڈیشنوں میں دست یاب ہے)؛ سائنٹفک میریکلس آف دی قرآن *Scientific Miracles of the Quran* –
https://www.Quranproject.org/Quran-Project-Appendix-Scientific-Miracles-of-The-Quran-225-d;
A. B. Al-Mehri, *Scientific Truths and the Qurān* –
https://www.Quranproject.org/Scientific-Truths-and-The-Quran-518-d) وغیرہ۔

تو وہ تھا جو اس وقت سے مستقل پھیلتا چلا جا رہا ہے(۲۱:۳۰)۔[۳]

۲۔ **کائنات اپنے آغاز میں گیس تھی:** "پھر وہ (اللہ) آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ (آسمان) (اس وقت) دھواں (گیس) تھا" (۴۱:۱۱)۔

۳۔ **کائنات ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے:** کائنات ایک دن سکڑ جائے گی اور اللہ تعالیٰ اسے "اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے کوئی کاغذ کا طومار لپیٹا جاتا ہے" (۲۱:۱۰۴)۔

۴۔ **انسانی جنین کئی مراحل میں پیدا ہوتا ہے:** جنین ماں کی کوکھ میں کئی مرحلوں سے گزر کر پیدا ہوتا ہے(۲۲:۵؛۱۴:۲۳،۴۰:۶۷؛۳۸:۷۵)۔

۵۔ **شکست خوردہ رومیوں کی فتحیاب فارسیوں پر فتح کی پیش گوئی:** قرآن نے ایک ایسے وقت میں جب کہ فارسیوں نے رومی سلطنت کے زیادہ تر حصوں کو فتح کر لیا تھا "چند سال میں ہی" فارسیوں پر رومیوں کے غالب ہو جانے کی پیشین گوئی کی (۳۰:۴-۲)۔ یہ آیت مکہ میں سنہ ۶۱۵ عیسوی میں نازل ہوئی تھی جب یہ لگتا تھا کہ فارسی ناقابل شکست ہیں لیکن ایک مختصر عرصے میں، جو قرآن نے پہلے سے بتا دیا تھا، طاقت کے پیمانے پوری طرح تبدیل ہو گئے۔[۴]

---

[۳] قرآنی حوالوں کے لیے یہاں پہلے آیت نمبر پھر کولن کے بعد سورہ نمبر کا اہتمام کیا گیا ہے۔

[۴] طاقت کے پلڑے رومیوں کے حق میں جھک جانے سے سات سال قبل یہ آیت ۶۱۵ عیسوی میں نازل ہوئی تھی۔ قرآن میں "چند سال" کے لئے "بضع سنین" کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ "بضع" کا مطلب عربی میں ۳ سے ۹ تک ہوتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے قریش کے سردار ابی ابن خلف سے، جس نے اس پیشین گوئی کا مذاق اڑایا تھا، اس بات پر شرط لگائی تھی کہ اگر یہ بات غلط ثابت ہو گئی تو وہ ابی کو دس جوان اونٹ (قلائص) دیں گے، اور اگر یہ بات صحیح ثابت ہوئی تو ابی بن خلف اتنے ہی اونٹ حضرت ابو بکر کو دے گا۔ ان لوگوں نے اس پیشین گوئی کے صحیح یا غلط ثابت ہونے کے لئے پانچ سال کا وقت طے کیا تھا۔ رومی چھ سال میں بھی غالب نہیں آسکے تو قریش نے اس پیشین گوئی کا پھر مذاق اڑایا اور ابی ابن خلف نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ اپنی شرط پوری کرو۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ابو بکرؓ سے کہا کہ تم نے نو سال کی شرط کیوں نہیں لگائی؟ عربی کی سب سے مستند ڈکشنری (لسان العرب ۸/ ۱۵) میں ہے کہ "بضع" کا مطلب ہے ۳ سے ۹ تک کا کوئی بھی عدد۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر سے کہا کہ ابی بن خلف کے ساتھ پھر سے شرط طے کرو اور اس سے کہو کہ اس بار وہ ایک سو جوان اونٹوں کی شرط لگائے۔ ابی اس بات پر فوراً راضی ہو گیا۔ کئی لڑائیوں کے بعد آخر کار رومیوں نے ایرانیوں کو نینوا کی لڑائی میں ۱۲ دسمبر ۶۲۷ء کو شکست دے دی جس کے بعد ایرانیوں نے دب کر صلح کی۔ رومیوں کی اس فتح کی خبر عرب میں مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کے دن (مارچ ۶۲۸ء) پہنچی۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر کو ابی ابن خلف کے بیٹوں نے طے شدہ مال ادا کیا کیوں کہ ابی ابن خلف اس دوران مر چکا تھا (طبری: ۲۱/ ۱۲ - ۱۵؛ ابن کثیر: ۲/ ۸۰۸-۸۱۲؛ قرطبی: ۱۴/ ۲-۵؛ کشاف ۸۲۴ - ۸۲۵)۔

۶۔ **کائنات میں ایسے کچھ ذرات ہیں جو ایٹم سے بھی چھوٹے ہیں:** قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ ذرے سے بھی چھوٹے کچھ مادے ہیں۔[۵]

۷۔ **کائنات کے راز مستقبل میں دریافت ہوتے رہیں گے:** قرآن یہ اشارہ کرتا ہے کہ کائنات کے اسرار و رموز مستقبل میں دریافت ہوتے رہیں گے (۶:۶۷، ۴۱:۵۳)۔

۸۔ **پانی ہر شئے کا جوہر خاص ہے:** اللہ نے "ہر جاندار شئے کو پانی سے بنایا" (۲۱:۳۰)۔

۹۔ **کائنات کو تخلیق کیا گیا ہے:** اللہ نے کائنات کو بنایا اور وہ اسے وسعت دئے جا رہا ہے (۵۱:۴۷)۔

۱۰۔ **پانی کے دو دھاروں کا ایک دوسرے میں نہ ملنے کا منظر نامہ:** نزول قرآن کے وقت عربوں کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔ قرآن نے ایک ایسے منظر نامے کا ذکر کیا جو جزیرۂ عرب سے بہت دور مختلف دریاؤں اور سمندروں کے سنگم پر دیکھنے میں آتا ہے (۲۵:۵۳؛ ۲۷:۶۱)۔[۶]

۱۱۔ **قرآن نے پیشین گوئی کی کہ ابو لہب اور اس کی بیوی کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔** (حالانکہ رسول اللہؐ کے اکثر دشمنوں نے آخرکار اسلام قبول کر لیا تھا) (۱۱۱:۳) لیکن ابو لہب اور اس کی بیوی کبھی اسلام نہیں لائے۔

۱۲۔ **تمام ذی روحوں کو جوڑوں یعنی نر و مادہ میں پیدا کیا گیا ہے:** ہر نوع کی مخلوق کو حتیٰ کہ پیڑ پودوں کو بھی جوڑوں میں بنایا گیا ہے یعنی ان میں ہر ایک میں نر اور مادہ جنس ہوتے ہیں (۱۳:۳؛ ۲۰:۵۳؛ ۲۶:۷؛ ۳۱:۱۰؛ ۳۵:۱۱؛ ۳۶:۳۶؛ ۴۲:۱۱؛ ۴۳:۱۲؛ ۴۹:۱۳؛ ۵۰:۷؛

---

[۵] قرآن کہہ رہا ہے کہ "ذرّہ" (atom) سے بھی چھوٹی چیزیں کائنات میں موجود ہیں۔ عصر حاضر سے پہلے کسی کو یہ حقیقت نہیں معلوم تھی۔ فیزیکل سائنس میں ایٹم سے چھوٹے ذرے (subatomic particles) ایٹم سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایٹم سے چھوٹے یہ ذرے "نیوٹرون" یا "پروٹون" ہو سکتے ہیں یا ایسے بنیادی (elementary) ذرے بھی ہو سکتے ہیں جو کسی اور ذرے سے مل کر وجود میں نہیں آئے ہیں۔ "ایٹم سے چھوٹے ذرے" کی اصطلاح ۱۹۶۰ء کے دہے میں پہلی بار استعمال ہوئی (دیکھئے: حاشیہ آیت ۶۱ : ۱۰، گلوریس قرآن، ایڈیشن ۳، ۲۰۲۵، ص ۳۳۶)۔

[۶] اس طرح کے ۱۲ مقامات دنیا میں پائے گئے ہیں۔ دیکھیں:
"Amazing Confluences From Around the World," 12 – http://www.theworldgeography.com/2012/05/12-amazing-confluences-from-around.html

۴۹:۵۱؛۴۵:۵۳؛۵۲:۵۵)۔

۱۳۔ **بارآور کرنا:** ہوائیں پیڑ پودوں کو بارآور کرتی ہیں (۱۵:۲۲)۔

۱۴۔ **ماحولیاتی گراوٹ** قدرتی وسائل کے ساتھ انسانوں کے کھلواڑ اور بدانتظامی کا نتیجہ ہے (۳۰:۴۱)۔

۱۵۔ **کائنات میں ساری چیزیں قوت کشش** کی وجہ سے بندھی ہوئی ہیں (۱۳:۲)۔

۱۶۔ **سورج** اپنے مقرر کردہ راستے پر چلا جارہا ہے (۳۶:۳۸)۔

۱۷۔ **پہاڑ زمین کا توازن برقرار رکھے ہوئے ہیں** (۱۳:۳؛ ۱۵:۱۹؛ ۱۶:۱۵؛ ۲۱:۳۱؛ ۲۷:۶۱؛ ۳۱:۱۰؛ ۴۱:۱۰؛ ۵۰:۷؛ ۷۷:۲۷؛ ۷۸:۷)۔

۱۸۔ **خلاء** میں اوپر اٹھتے جانے پر آکسیجن کی سطح کم ہوتی جاتی ہے (۶:۱۲۵)۔

۱۹۔ اللہ تعالیٰ جہنم میں گنہ گاروں کی جلی ہوئی کھالوں کو نئی کھالوں سے بدلتا رہے گا تاکہ وہ عذاب کا مزہ لگاتار چکھتے رہیں (۵۶ : ۴)۔ زمانۂ قدیم میں لوگوں کو نہیں معلوم تھا کہ انسان اپنے چمڑے کے ذریعے الم محسوس کرتا ہے[۷]۔

۲۰۔ قرآن کہتا ہے کہ تمام ذی روح اشیاء انسانوں کی ہی طرح ایک خاص نوعِ مخلوق (species) ہیں (۶:۳۸)۔

مآخذ (حواشی میں مذکور حوالوں کے علاوہ)

لسان العرب: ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ب.ت.۔

طبری: ابن جریر الطبری، جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار المعرفۃ، بیروت (طبعۃ مصورۃ عن طبعۃ بولاق ۱۳۲۷ھ)۔

ابن کثیر: ابن کثیر، عمدۃ التفاسیر، مختصر تفسیر القرآن العظیم لاحمد شاکر، دار الوفاء، القاھرۃ، ط:۲، ۲۰۰۵۔

قرطبی: محمد بن احمد الانصاری القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، دار الکتب المصریۃ، القاھرۃ، ط:۲، ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء۔

کشاف: محمود بن عمر الزمخشری، تفسیر الکشاف، تحقیق: خلیل مأمون شیحۃ، دار المعرفۃ، بیروت، ط:۳، ۲۰۰۹۔

---

[۷] یہ ان بہت سے سائنسی حقائق میں سے ایک ہے جو قرآن پاک کے نزول کے وقت انسان کو نہیں معلوم تھے۔ جدید میڈیکل سائنس بتاتی ہے کہ انسان جلد کے ذریعے درد کو محسوس کرتا ہے (دیکھیے: ۵۶ : ۴)۔

کلامِ شیخ العالم: توحید و سنت کی روشنی میں کشمیری معاشرے کی اصلاح

اشتیاق احمد وگے
سینئر ریسرچ اسکالر، سینٹرل یونیورسٹی آف کشمیر
Ishtiyaq.wagay@gmail.com

شیخ نور الدین (۱۳۷۷-۱۴۴۰ء)، جنہیں اہلِ کشمیر محبت سے "شیخ العالم" اور "نورالدین ریشی" کے القاب سے یاد کرتے ہیں، وادیٔ کشمیر کے عظیم صوفی شاعر، مصلحِ دین اور ریشی تحریک کے بانی تھے۔ آپ نے چودھویں صدی کے پیچیدہ اور فکری طور پر منتشر کشمیری معاشرے کو اپنی شاعری، روحانی بصیرت، اور عملی دعوت سے نہ صرف دینی و اخلاقی شعور بخشا بلکہ ایک نئی سماجی روح پھونک دی۔ آپ کی شاعری، جسے کشمیری زبان میں "شروک" کہا جاتا ہے، نہایت سادہ اور دل نشین پیرائے میں توحید، سنتِ نبویؐ، اور شریعتِ مطہرہ کے اصول عوام تک پہنچاتی ہے۔ آپ نے اپنی تعلیمات میں شرک و بدعت اور غیر اسلامی رسومات جیسے مورتی پوجا، قبروں کی غیر شرعی تعظیم اور ذات پات کے امتیاز، پر کھل کر تنقید کی۔ اس زمانے میں کشمیر کے سماج میں ہندو مت، بدھ مت اور برہمنیت کے گہرے اثرات نو مسلم آبادی کے عقائد و اعمال میں رچ بس گئے تھے۔ حضرت عبد الرحمن بلبل شاہ (م:۱۳۲۷ء) نے وادی میں اسلام کا جو بیج بویا تھا[1]، وہ بعد ازاں ساداتِ کرام خصوصاً حضرت میر سید علی ہمدانی (۱۳۱۲-۱۳۸۴ء) کی مسلسل محنت اور حکمتِ عملی سے جڑ پکڑنے لگا۔ صوفیاء چونکہ انسانی فطرت کے نباض اور داعیانہ حکمت کے علمبردار ہوتے ہیں، اس لیے انہوں نے نو مسلم کشمیریوں کی تدریجی اصلاح کا کام کیا۔ مثال کے طور پر، چونکہ ہندو اپنے مندروں میں اجتماعی طور پر بلند آواز میں منتر پڑھنے کے عادی تھے، اس لیے ان کے سامنے "اورادِ فتحیہ" پیش کی گئی، جس نے ایک طرف انہیں واحد و بے نیاز اللہ کی معرفت دی اور دوسری

(۱) محمد اعظم دیدمری، واقعات کشمیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، جموں و کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر، ۲۰۱۹ء، ص ۵۴؛ غلام حسن کھویہامی، تاریخ حسن، جلد ۲، ترجمہ: شریف حسین قاسمی، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳ء، ص ۴۷؛ محی الدین مسکین، تاریخ کبیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۔

طرف انہیں یک آواز ہو کر اجتماعی ذکر کی اسلامی صورت سے آشنا کیا۔[۲] اس حکمتِ عملی نے قبولِ اسلام کے عمل کو نہایت آسان بنا دیا اور لوگ جوق در جوق دینِ حق میں داخل ہونے لگے۔

بلبل شاہ کے عہد سے قبل بھی صوفیاء اور وسط ایشیا سے آنے والے مسلمان فوجیوں نے وادی میں اسلام کو متعارف کرایا تھا[۳] جس کے نتیجے میں شہر کے وسط میں ''ملیچھ مر'' کے نام سے ایک مسلم بستی آباد ہوئی تھی۔ اس کا ذکر چودھویں صدی کے معروف سیاح مارکو پولو (۱۳۲۴-۱۲۵۴ء) نے بھی اپنے سفر نامے میں کیا ہے[۴] اور آج تک یہ جگہ اسی نام سے پہچانی جاتی ہے۔

شیخ العالم نے حضرت میر سید علی ہمدانی کے فرزند، حضرت میر محمد ہمدانی (۱۳۷۲ - ۱۴۴۸ء)، جو اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھانے کی غرض سے کشمیر تشریف لائے، کی راہنمائی میں اور ان سے خطِ ارشاد حاصل کر کے اپنے اصلاحی سفر کو مزید جِلا بخشی۔[۵] آپ نے اپنی سادہ، عرفانی اور علامتی شاعری کے ذریعے نہ صرف اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچایا بلکہ غیر اسلامی اثرات کو بھی للکارا، اور ایک ایسی اسلامی شناخت کو پروان چڑھایا جو مقامی ثقافت کے مثبت پہلوؤں سے ہم آہنگ تھی مگر ہر طرح غیر شرعی رسوم سے پاک تھی۔

توحید کی ترویج اور شرک کی مخالفت: چودھویں صدی کا کشمیر ایک ایسا خطہ تھا جہاں ہندو مت، بدھ مت اور برہمنیت کی صدیوں پرانی تہذیبی و مذہبی روایات نو مسلم معاشرے پر گہرا اثر ڈال رہی تھیں۔ اس دور میں شرکیہ عقائد اور رسوم، جیسے مورتی پوجا، دیوی دیوتاؤں کی تعظیم، قبروں پر غیر شرعی عقیدت کا اظہار، اور مقامی تیرتھوں کی زیارت، عام مسلمانوں میں جاری تھیں، یہاں تک کہ سلطنت کے سربراہ بھی اس رجحان سے متأثر تھے۔ سلطان زین العابدین (۱۴۲۰ - ۱۴۷۰ء) ہندو تہواروں میں شرکت کرتے تھے، خصوصاً دریائے جہلم کے علامتی یومِ پیدائش ویتھ ترُوَہ،

---

(۲)

Mohammad Ashraf Wani, Islam in Kashmir, Oriental Publishing House, Srinagar, 2004, p. 219.

(۳) علی کوفی، فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ، ترجمہ: اختر رضوی، سندھی ادبی بورڈ، جام شورو، ۲۰۰۸، ص ۲۰۶۔

(۴)

Thomas Wright, The Travels of Marco Polo The Venetian, George Bell and Sons, London, 1899, p. 90.

(۵) کھویہامی، تاریخ حسن، جلد ۳، ص ۸۸؛ مسکین، تاریخ کبیر، ص ۵۱، ۵۲۔

ناگ یاترا اور گن چکر جیسے مواقع پر، جہاں وہ پوجا کرنے والوں کو کریم اور سالن پیش کرتے تھے۔[۶] جون راج (۱۳۸۹ - ۱۴۵۹ء) کے مطابق، سلطان تمام ہندو ذاتوں کے لوگوں کو اسی طرح تحفظ اور نوازش دیتا جیسے اپنے بچوں کو[۷]، اور شاید یہی وجہ تھی کہ ہندو انہیں محبت سے بڈہ شاہ (ہندوؤں کا بادشاہ) کہا کرتے تھے۔[۸] مغل بادشاہ جہانگیر (۱۵۶۹- ۱۶۲۷ء) نے توزکِ جہانگیری میں لکھا کہ کشمیری ویتھ تُروَہ کے دن اپنے گھروں میں چراغاں بالکل اسی طرح کرتے ہیں جیسے مسلمان شبِ برات پر کرتے ہیں۔[۹] اسی طرح حسین شاہ چک (حکومت: ۱۵۶۲ - ۱۵۶۹ء) بھی نَوریہہ اور بسنت پنچمی جیسے ہندو تہواروں میں شریک ہوتے تھے اور ہندوؤں کو تحائف پیش کرتے تھے۔[۱۰] یہ سب واقعات اس دور کے ثقافتی امتزاج کی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہ اثر صرف عوام یا تہواروں تک محدود نہ تھا۔ سترہویں صدی کے افغان گورنر علی مردان خان نے سنسکرت میں شیوا ستتی کے عنوان سے ایک شلوک تخلیق کیا، جو ہندو دیوتا شیو کی تعریف میں تھا[۱۱]، یہ اُس

---

(۶)

Mohibbul Hasan, *Kashmir Under the Sultans*, Iran Society, Calcutta, 1959, p. 87-88; N.K. Singh, *Islamic Heritage of Kashmir*, vol. 2, Gulshan Publishers, Srinagar, 2000, p. 60; R.K. Parmu, *A History of Muslim Rule in Kashmir*, People's Publishing House, Delhi, 1969, p. 450; P.N. Bazaz, *The History of Struggle for Freedom in Kashmir*, Kashmir Publishing Company, New Delhi, 1954, p. 93.

(۷)

Jonaraja, *Rajatarangini*, trans. J.C. Dutt, Gian Publishing House, New Delhi, 1986, pp. 77, 92.

(۸)

Jia Lal Kilam, *A History of Kashmiri Pandits*, S.N. Dhar, Srinagar, 1955, p. 56.

(۹)

Singh, Islamic Heritage, p. 60; Parmu, A History of Muslim Rule, pp. 450-451.

(۱۰)

Singh, Islamic Heritage, p. 60; Parmu, *A History of Muslim Rule*, pp. 450; Henny Sender, *The Kashmiri Pandits: A Study of Cultural Choice in North India*, Oxford University Press, Delhi, 1988, p. 26.

(۱۱)

Neerja Mattoo, "Syncretic Tradition and the Creative Life: Some

عہد کے شرکیہ اثرات کی ایک نمایاں مثال ہے۔ چنانچہ جب اشرافیہ ایسے رسوم کی طرف مائل تھی تو عوام کی دینی تعلیم سے محرومی نے انہیں مزید ہندو اور بدھ مت کی روایات کے قریب کر دیا تھا۔ یہ عقائد اسلام کی اصل روح، یعنی توحید اور اللہ کی وحدانیت، سے متصادم تھے۔ اسی پس منظر میں شیخ نورالدین نے اپنی شاعری کے ذریعے توحید کو ایک نور کے طور پر پیش کیا، جو انسان کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالتی ہے۔ انہوں نے شرک کو جہالت اور روحانی بربادی کا سبب بتایا۔ اُویسیہ اور کُبرویہ سلسلے کی صوفیانہ روایات سے متأثر ہو کر انہوں نے اپنے کلام کو عام فہم بنایا[۱۲] تاکہ یہ براہِ راست کشمیری عوام کے دلوں تک پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ العالم کے کلام کو "کاشُر قرآن" اور "کشمیری دینیات" کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔[۱۳]

توحید کی اہمیت اور اللہ کی وحدانیت کا پیغام: چودھویں صدی کے کشمیر میں، لوگ اللہ کی وحدانیت سے غافل تھے، اور شرکیہ عقائد، جیسے مورتی پوجا، پیر پرستی، آستان پرستی اور قبروں کی غیر شرعی تعظیم میں مبتلا تھے۔ شیخ العالم نے اپنی شاعری میں توحید کو ایک ایسی روشنی سے تعبیر کیا جو انسان کو روحانی گمراہی سے نجات دیتی ہے:

سُہ میے نِشے بہ تس نِشے   میے تس نِشے قرار آو
نحقے ژھونڈُم میے پر دِشے   پننے دِشے میے یار آو[۱۴]

(انسان اپنی بے وقوفی، کم عقلی، کم علمی اور جلد بازی سے اللہ تعالیٰ کو دوسری جگہوں پر (جنگلوں، تیرتھوں، مقبروں اور بتوں کی صورت میں) پانے کی لاحاصل کوشش میں عمر ضائع کرتا ہے۔ انسان کو علم وعقل کام میں لا کر اپنے دل سے پوچھنا چاہیے کہ حقیقت ازلی اور لازوال ہستی کون

Kashmiri Mystic Poets," in *The Parchment of* Kashmir*: History, Society and Polity*, ed. Nyla Ali Khan, Palgrave Macmillan, New York, 2012, p. 89.

(۱۲) Abdul Qaiyum Rafiqi, *Sufism in Kashmir (From the Fourteenth to Sixteenth Century)*, Bharatiya Publishing House, Varanasi, 1972, p. 142.

(۱۳) Wani, Islam in Kashmir, p. 68; Muhammad Ishaq Khan, Islamic and Cultural Foundations of Kashmiriyat, Primus Books, New Delhi, 2021, p. 195;
محمد فاروق بخاری، کشمیر میں اسلام: منظر اور پسِ منظر، مکتبہ علم وادب، سرینگر، ۲۰۱۳، ص ۱۶۲۔

(۱۴) غلام محمد شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۵۰۔

ہے؟ یہ سمجھ میں آجائے تو اپنے دل ہی میں وہ سکون و قرار پائے گا) ۔

یہ شعر شیخ العالم کی تعلیمات میں توحید کی گہری روح کو بیان کرتا ہے۔ اس میں وہ انسان کو جھنجھوڑ کر متوجہ کرتے ہیں کہ حقیقی خدا کی تلاش اپنے دل و دماغ کو استعمال کرنے اور فکر و تدبر سے حقیقت کو پہچاننے میں ہے۔ شیخ العالم بتاتے ہیں کہ انسان اکثر جہالت، جلد بازی اور تقلیدی رویے کے سبب اپنی عمر ان جگہوں اور طریقوں میں ضائع کرتا ہے جو اسے اصل خالق تک نہیں پہنچاتے۔ اگر وہ علم و عقل کا سہارا لے کر اپنے دل سے سوال کرے کہ ”ازلی اور ابدی ہستی کون ہے؟“ تو اسے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، جو ہر جگہ موجود ہے۔ جب یہ پہچان حاصل ہو جائے تو سکون اور قرار کسی دور دراز مقام میں نہیں بلکہ خود اپنے دل ہی میں ملتا ہے۔ یہ پیغام دراصل توحید کی اصل روح ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، یکتا ہے، اور اس تک رسائی کے لیے کسی واسطے، مجسم صورت یا ظاہری مظہر کی ضرورت نہیں، بلکہ خالص ایمان اور قلبی معرفت کافی ہے۔

شرک کی مذمت اور غیر اسلامی عقائد کی تنقید: شرک، یعنی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اُس دور کے کشمیری معاشرے میں گہری جڑیں رکھتا تھا، جو مورتی پوجا، قبروں کی غیر شرعی تعظیم اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ کھیر بھوانی مندر جیسے مقامات پر دیوی رگنیا کو دودھ، کھیر اور پھول پیش کرنا عام رسم تھی۔ مسلمان بھی تری پور سندری دیوی، تری سندھیا دیوی اور رگنیا بھگوتی کے مندروں میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر دعائیں کرتے تھے۔[۱۵] تولہ مولہ گاندربل اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مسلمان گوشت کھانے کے بعد احتراماً مندر کے صحن میں داخل نہ ہوتے۔[۱۶] دیوی کے احترام کا یہ عالم تھا کہ مسلمان سنجیدہ منت مانتے یا قسم کھاتے وقت بھی کھیر بھوانی کو پکارتے۔ جب گائے بچھڑا دیتی تو اس کا شروع دودھ کھانے سے پہلے دیوی کو بطور نذرانہ کھیر بنا کر پیش کیا جاتا۔[۱۷] بقول والٹر لارنس:

---

[۱۵] بلجی ناتھ پنڈت، ”کشمیر کی مخصوص روایت اور سماجی یکجہتی“، شیرازہ (ثقافت نمبر)، جلد ۵، شمارہ نمبر ۱، جون ۱۹۶۶، ص ۳۰۸۔

[۱۶]

Omkar Razdan, *The Trauma of Kashmir: The Untold Reality,* Vikas Publishing House, New Delhi, 1999, p. 57.

[۱۷] بلجی ناتھ پنڈت، ”کشمیر کی مخصوص روایت“، ص ۳۰۸۔

کشمیری سنی صرف نام کے مسلمان تھے؛ دل سے وہ ہندو تھے، اور اسلام ان کی توہم پرستانہ خواہشات کو مٹانے میں ناکام تھا۔ ان کے بہت سے خیالات اور رسومات ہندوؤں کے ساتھ مشترک تھیں۔(۱۸)

حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے اپنے مکتوبات میں کشمیر کے اس روحانی اور اخلاقی زوال پر گہرے افسوس کا اظہار کیا۔ انہوں نے وادی کو "کفار کی سرزمین" قرار دیتے ہوئے لکھا کہ دنیا پرستی اور باہمی فساد نے خلوص و اخلاص اور مخلص رفاقت کی جگہ لے لی تھی۔(۱۹) بہر صورت، یہ عقائد توحید کے منافی تھے۔ قرآن اس کی مذمت کرتا ہے: "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ"(۲۰)، یعنی بے شک شرک ایک بڑا ظلم ہے۔ حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أَكْبَرُ الْكَبَائِرِ الإِشْرَاكُ بِاللَّهِ"(۲۱)، یعنی سب سے بڑا گناہ اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ شیخ العالم نے شرک کو ایک ایسی گمراہی قرار دیا جو انسان کو آخرت میں شرمندگی اور عذاب کی طرف لے جاتی ہے۔ انہوں نے شرک کی مختلف شکلوں، جیسے مورتی پوجا اور قبروں کی غیر شرعی تعظیم، کی سخت تنقید کی۔ چنانچہ اپنے ایک شعر میں فرماتے ہیں:

ہِندین ہنز کامہ تراوی تو!ہا نُندیو تراوی تو پراوی تو حقہ سنز وَتھ
حضرت محمد متہ مشی راوی تو اسِہ نِن دوزخس تِمن روزِ کتھ(۲۲)

(اے مسلمانو! ہندوؤں کے کام یعنی شرک، بت پرستی اور رسم و رواج پرستی چھوڑ دو۔ عقل سے کام لے کر ایک اللہ تعالیٰ کا راستہ پکڑو۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اطاعت میں غفلت و تساہل مت کرو۔ ہمارے خلافِ قرآن و سنت کام ہمیں تو جہنم میں پہنچا ہی

---

(۱۸)

Walter Lawrence, *The Valley of Kashmir,* Oxford University Press, London, 1895, p. 286.

(۱۹)

A.Q. Rafiqi, trans., Maktubat-i-Mir Sayyid 'Ali Hamadani, Gulshan Publishers, Srinagar, 2007, pp. 77-81.

(۲۰) القرآن، ۳۱:۱۳۔

(۲۱) صحیح بخاری، ۶۸۷۱۔

(۲۲) شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۸۴-۸۵؛ اسد اللہ آفاقی، کلیات شیخ العالم، لائف فاونڈیشن، چرار شریف، ۲۰۰۸، ص ۳۶۶۔

دیں گے لیکن رسول برحق ضرور آزردہ ہو جائیں گے)

شیخ العالمؒ کے اس شعر میں شرک کی سخت مذمت اور غیر اسلامی عقائد و رسوم پر تنقید کی گئی ہے۔ وہ مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی طرح شرک، بت پرستی اور بے بنیاد رسم و رواج میں نہ پڑیں بلکہ عقل و فہم سے کام لیتے ہوئے صرف ایک اللہ کی عبادت اور اس کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی کامل پیروی اختیار کریں۔ شیخ العالم واضح کرتے ہیں کہ قرآن و سنت سے انحراف نہ صرف انسان کو جہنم کا مستحق بناتا ہے بلکہ اللہ کے برحق رسول ﷺ کو بھی آزردہ کرتا ہے، اس لیے توحید پر قائم رہنا ہی دنیا و آخرت کی نجات کا واحد راستہ ہے۔

شرک کی سماجی شکلوں کی تنقید: شرک کی کئی سماجی شکلیں، جیسے قبروں کی غیر شرعی تعظیم، پیر پرستی، آستانہ پرستی، اور مقامی تیرتھوں کی زیارت کشمیری معاشرے میں رائج تھیں حالانکہ یہ براہِ راست توحید کے بنیادی اصول سے متصادم تھیں۔ لارنس اس رجحان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ہر کشمیری کا عقیدہ ہے کہ "اگر انسان اولیاء کو پکارے تو وہ مدد کو پہنچیں گے"، اور یہ بھی کہ ایک وفات یافتہ ولی، زندہ عالم یا پیر سے زیادہ مؤثر اور کارگر ہوتا ہے۔ غیر ملکی کشمیریوں کو "پیر پرست" کہتے ہیں، اور یہ لقب بے وجہ نہیں[۲۳]۔

لارنس مزید بیان کرتا ہے کہ کشمیری جب کسی آفت یا مصیبت کا شکار ہوتے ہیں، تو مسجد کا رخ کرنے کے بجائے آستانوں کی طرف لپکتے ہیں۔ اس کیفیت کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> یعنی، زلزلے یا ہیضہ جیسی آفات کے وقت کشمیری دعا و مناجات میں مصروف ہو جاتے ہیں اور خانقاہوں و مساجد کی مرمت میں غیر معمولی سرگرمی دکھاتے ہیں، مگر خوش حالی اور سکون کے دنوں میں یہی مقامات ویران اور خستہ حال رہ جاتے ہیں، اور وہ ملا کی باتوں پر کم ہی توجہ دیتے ہیں[۲۴]۔

کشمیر میں آستانہ پرستی کے حوالے سے انیسویں صدی کے معروف میڈکل مشنری[۲۵]

---

(۲۳) Lawrence, *The Valley of Kashmir*, p. 286.

(۲۴) Lawrence, *The Valley of Kashmir*, p. 285.

(۲۵) عیسائیت کا داعی

ارنسٹ نیوے Ernest Neve نے بھی نہایت اہم مشاہدہ قلمبند کیا ہے:

عام کشمیری مسلمان کی مذہبی زندگی میں اپنے گاؤں کے آستانے سے عقیدت، اس کا احترام اور اس پر کامل بھروسہ، قرآن یا اس کی تعلیمات کے کسی خاص اہتمام سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ لوگ نبی محمد ﷺ کے نام کا احترام کرتے ہیں، مگر ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ لوگوں کے نزدیک آستانہ ہی بیماری اور مصیبت سے حفاظت کرتا ہے، اور کسی بھی کام میں کامیابی یا مشکل وقت میں وہ اسی سے مدد کے طلبگار ہوتے ہیں(۲۶)۔

یہ مشاہدہ دراصل اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ عوام کے عقیدے میں دین کا مرکز و محور وحی یا نبوی سنت نہیں، بلکہ مقامی آستانوں کی کرامات اور ان سے وابستہ قصے اور کہانیاں ہیں، جو وقت کے ساتھ ایک مضبوط سماجی و روحانی روایت کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ علاوہ ازیں، کشمیری عوام میں ایک پرانا عقیدہ نسل در نسل منتقل ہوتا آیا ہے کہ جو شخص بومزو، چرار شریف اور عیش مقام کے ریشیوں کے مزارات پر حاضری دیتا ہے، وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔ اس ایمان کو وہ ایک سادہ مگر پُراثر لوک گیت میں یوں سمیٹتے ہیں:

یُس گژِھ بُومزُو، ژرار، مُقام تَس پیٹھ چُھ دوزخُن نار حرام(۲۷)

(جو شخص بومزو، چرار شریف اور عیش مقام کے ریشیوں کے مزارات پر حاضری دے گا، وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔)

یہ مذکورہ عقیدے اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ کس طرح عوام نے اپنی امیدوں اور حاجتوں کا مرکز اللہ کے بجائے مزارات اور قبروں کو بنالیا، جو اسلامی عقیدۂ توحید سے کھلا انحراف ہے۔ پیرپرستی اور آستانہ پرستی کے ساتھ ساتھ، کشمیری مسلمانوں میں متبرک آثار کے احترام کی ایک گہری روایت بھی پائی جاتی ہے، جو دراصل اُن کے بدھ مت اور ہندو ماضی کی وراثت ہے۔ بدھ مت کے دور میں اسٹوپاؤں (Stupas) میں گوتم بدھ کے تبرکات کو نہایت احترام سے محفوظ

---

(۲۶)

Ernest F. Neve, Beyond the Pir Panjal: Life and Missionary Enterprise in Kashmir, Church Missionary Society, London, 1914, p. 125.

(۲۷)

Farooq Fayaz, Folklore and History of Kashmir, Nuneposh Publications, Srinagar, 2001, p. 160.

کیا جاتا تھا، جبکہ ہندومت میں کھیر بھوانی جیسے مندروں پر مقدس اشیاء کی تعظیم کی جاتی تھی۔ لارنس اس رجحان کا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فتح پورہ، ویر ناگ اور وار پورہ ہندواڑہ میں ایک پتھر پر کندہ قدم کے نشان کو مسلمان "قدمِ رسول" اور ہندو "وشنو پاد" یعنی وشنو کے قدم کے طور پر مانتے ہیں۔[۲۸] اسی طرح، صورہ سرینگر میں ایک بڑے قدم کے نشان کو مسلمان "قدمِ رسول"، ہندو "وشنو پاد"، اور بدھ مت کے پیروکار "شاکیا مُنی پاد" یعنی بدھ کے قدم کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔[۲۹] تاہم، قرآن مجید ان تمام صورتوں کو شرک قرار دیتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے: "وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ"[۳۰]، یعنی اللہ کے سوا اس کو مت پکار جو نہ تجھے نفع دے اور نہ نقصان پہنچا سکے۔ اسی طرح حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللهِ نِدًّا دَخَلَ النَّارَ"[۳۱]، یعنی جو شخص اس حال میں مرا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو پکارتا تھا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔ شیخ العالم نے بھی اس قسم کی سماجی اور ثقافتی شکلوں میں پنپنے والے شرک کو جہالت اور گمراہی قرار دیا اور لوگوں کو توحید کے خالص پیغام کی طرف بلایا۔ جیسا کہ اُن کا مشہور شعر ہے:

دُوی تراو تہ مو لاگ چرندہ ہلی ہلی مو پکھ، پکھ سیزوتی[۳۲]

(شرک اور مشرکانہ طور طریقے اور توہم پرستانہ اعتقادات چھوڑ دو۔ حیوان کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنا چھوڑ دو۔ ٹیڑھے میڑھے یعنی کفر و شرک اور بدعات و خرافات کے سب طور طریقوں کو چھوڑ کر توحید کا راستہ اختیار کرو)

یہ شعر شیخ العالمؒ کے اصلاحی افکار اور عقیدۂ توحید کی دعوت کو نہایت سادہ لیکن گہری معنویت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس میں واضح طور پر لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ شرک، مشرکانہ رسوم

---

(۲۸) Lawrence, *The Valley of Kashmir*, p. 286.

(۲۹) Navnita Chadha Behera, *State, Identity and Violence: Jammu, Kashmir and Ladakh,* Manohar Publishers and Distributors, New Delhi, 2000, p. 35.

(۳۰) القرآن، ۱۰:۱۰۶۔

(۳۱) صحیح بخاری، ۴۴۹۷۔

(۳۲) شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۲۱۶۔

اور توہم پرستانہ عقائد کو ترک کریں، کیونکہ یہ عوامل انسانی معاشرے کو فکری و عملی گمراہی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ شعر میں استعمال شدہ "حیوان کی طرح بھٹکنا" کا استعارہ اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ جب انسان اپنی فکری سمت سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ غیر شعوری اور بے ہدف طرزِ حیات اختیار کر لیتا ہے، جو نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی سطح پر انحطاط کا باعث بنتا ہے۔ شیخ العالم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کفر، شرک، بدعات اور خرافات کی پیچیدہ اور بے ربط راہوں کو ترک کر کے خالص توحید کے واضح، سیدھے اور معقول راستے کو اپنایا جائے۔ اس پیغام میں ایک اصلاحی اور نظریاتی جدوجہد کا تصور ملتا ہے جو معاشرتی استحکام، فکری تطہیر اور روحانی کامیابی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

سنت و شریعت کی پاسداری اور بدعت کی تنقید: کشمیر میں ہندو مت، بدھ مت اور برہمنیت کے گہرے پرانے اثرات نو مسلم معاشرے میں نمایاں طور پر جھلکتے تھے۔ غیر شرعی رسومات اور بدعات، جیسے تیرتھوں (مقدس مقامات) کی غیر شرعی تعظیم، خود ساختہ مذہبی طریقے، اور غیر اسلامی تہواروں میں شمولیت، عام تھی۔ یہ رویے نہ صرف اسلامی تعلیمات سے متصادم تھے بلکہ دین کی خالص روح کو مسخ کر رہے تھے۔ شیخ نورالدین نے اس بگڑی ہوئی فضا میں اپنی شاعری کو اصلاح ور ہنمائی کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی سنت اور شریعت کو زندگی کا بنیادی رہنما قرار دیتے ہوئے بدعت کو دین کے لیے زہر سے تشبیہ دی۔ صوفیانہ حکمت اور عوامی مزاج سے ہم آہنگ ہو کر انہوں نے اپنے پیغام کو سادہ، عام فہم اور دل نشین زبان میں پیش کیا تاکہ وہ براہِ راست کشمیری عوام کے دلوں میں اتر سکے اور انہیں توحید اور سنت کی طرف واپس پلٹا سکے۔

سنت کی اہمیت اور نبی ﷺ کی پیروی: چودھویں صدی کے کشمیری معاشرے میں لوگ سنت، یعنی نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال سے ناواقف تھے۔ اس دور میں اعلیٰ طبقے کے مسلمان بھی غیر اسلامی رسومات میں شریک ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر سلطان زین العابدین کی سدھاپوری میں یوگیوں کی سرپرستی اور ہیرتھ جیسے تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت سنت سے انحراف کی عکاسی کرتی ہے۔ بعد کے دور میں مغل بادشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶ء) کا کشمیر میں دیوالی اور دسہرہ میں شرکت کرنا بھی اسی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان غیر شرعی رسومات نے لوگوں کو سنت

سے دور کیا تھا۔ قرآن مجید اس معاملے میں واضح رہنمائی دیتا ہے: "۴ "[۴۳] (کہہ دو: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا)۔ حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا: "مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي"[۴۴] (جس نے میری سنت سے منہ موڑا، وہ مجھ سے نہیں)۔ شیخ العالم نے اسی اصول کو بنیاد بنا کر کشمیری معاشرے کو سنت کی طرف لوٹنے اور بدعات سے اجتناب کرنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نبی ﷺ کی سنت کو نجات کا واحد راستہ قرار دیا۔ انہوں نے سنت کو ایک ایسی روشنی سے تعبیر کیا جو زندگی کے ہر پہلو کو منور کرتی ہے:

محمد ﷺ تہ ژور یار بر حق گنزرکھ تِمن نِشہ اندنے ساری نیاے
مال و جان پنہ نُے تِہنزِ وتہِ بنزرکھ سوے چھے تور کِژ بڑ رہکاے[۴۵]

(حضرت محمد ﷺ اور اُن سے تربیت یافتہ چاروں خلفائے راشدین کو برحق جان لو۔ ان کے پاس تمہارے دین و دنیا کے سارے معاملات اور مسائل حل ہونگے۔ اپنا مال اور جان اُن ہی کی پیروی میں خرچ کرو۔ یہ عقبی میں تمہارے لئے بہت بڑا سرمایہ نجات ثابت ہوگا)

یہ شعر نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی کو دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن قرار دیتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے میر شمس الدین عراقی (۱۴۴۰-۱۵۱۵ء) کی جانب سے ہندو تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت کی ممانعت بھی سنت کی پاسداری کا ایک مظہر تھی، مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب کشمیری ہندوؤں نے سلطان فتح شاہ (حکومت: ۱۴۹۳-۱۴۸۶؛ ۱۵۰۵-۱۵۱۴ء) کے سامنے عراقی کے خلاف شکایت درج کرائی تو سلطان اس قدر غضبناک ہوئے کہ پہلے انہوں نے عراقی اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا مگر مشیروں نے انہیں اس سخت اقدام سے روک دیا[۴۶]۔ میر سید علی ہمدانیؒ کے مکتوبات میں اخلاقی انحطاط پر

---

[۴۳] القرآن، ۳۱:۳۔

[۴۴] صحیح بخاری، ۵۰۶۳۔

[۴۵] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۷۵؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۹۵؛ موتی لال ساقی، کلیات شیخ العالم، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لیگویجز، سرینگر، ۲۰۰۹، ص ۳۰۔

[۴۶] محمد علی کشمیری، تحفۃ الاحباب، ترجمہ: غلام رسول جان، جلد ۲، جان پبلکیشنز، سرینگر، ۲۰۱۸، ص ص ۳۲۶، ۳۲۷؛
Sender, *The Kashmiri Pandits*, p. 25-26.

کی گئی تنقید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف اشرافیہ بلکہ عوام کی دینی ناواقفیت نے ہیرتھ اور نَوریہہ جیسے غیر اسلامی تہواروں کو جڑ پکڑنے کا موقع دیا۔

بدعت کی تنقید اور غیر شرعی رسومات کی مذمت: کشمیری معاشرے میں بدعت، یعنی دین میں وہ غیرشرعی اضافے جو اللہ اوراس کے رسول ﷺ نے مقرر نہیں کیے، تیزی سے پھیل رہے تھے۔ ان میں قبروں کی تعظیم، ہیرتھ جیسے ہندو تہواروں میں مسلمانوں کی شرکت، لیلی گانے اور دیگر خودساختہ رسومات شامل تھیں۔ یہ اعمال دین کی خالص شکل کو مسخ کر رہے تھے۔ شیخ العالم نے بدعت کو جہالت اور گمراہی سے تعبیر کیا اور اسے دین کے لیے زہر قرار دیا۔ انہوں نے لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی:

ہیندین ہنز کامِہ تراوی تو!ہا نُندیو پراوی تو حقہ سنز وتھ!تراوی تو
حضرت محمد متہ مشی راوی تو اسِہ نِن دوزخس تِمن روزِ کتھ[۳۷]

(اے مسلمانو! ہندوؤں کے کام یعنی شرک، بت پرستی اور رسم ورواج پرستی چھوڑ دو۔ عقل سے کام لے کر ایک اللہ تعالیٰ کا راستہ پکڑو۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی پیروی اور اطاعت میں غفلت و تساہل مت کرو۔ ہمارے خلافِ قرآن و سنت کام ہمیں تو جہنم میں پہنچا ہی دیں گے لیکن رسول برحق ﷺ ضرور آزردہ ہو جائیں گے)

شیخ العالم کا یہ شعر بدعت اور غیر شرعی رسومات کی سخت تنقید کرتا ہے۔ وہ مسلمانوں کو ہندوانہ رسومات، شرک، اور بت پرستی ترک کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ خبردار کرتے ہیں کہ قرآن و سنت کے خلاف عمل نہ صرف جہنم کا باعث بنے گا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آزردہ کرے گا۔

برہمنیت کی تنقید اور کشمیری معاشرے کی اصلاح: چودھویں صدی کے کشمیر میں، برہمنیت کے گہرے اثرات نے نو مسلم کشمیری معاشرے کو متاثر کیا تھا۔ غیر اسلامی رسومات، جیسے مورتی پوجا، ذات پات کا نظام، گائے کے گوبر اور پیشاب کی تعظیم، اور غیر شرعی تہوار مسلمانوں میں رائج تھے۔ یہ رسومات نہ صرف اسلامی تعلیمات کے منافی تھیں بلکہ سماجی انصاف اور مساوات کے اصولوں کو بھی نقصان پہنچاتی تھیں۔ شیخ نور الدین نے اپنی شاعری کے ذریعے ان غیر شرعی رسومات کی

---

[۳۷] شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۸۴۔

سخت تنقید کی اور ایک ایسی اسلامی شناخت کو فروغ دیا جو مقامی ثقافت کے مثبت پہلوؤں، جیسے فطرت سے محبت اور سادگی، کو قبول کرتی تھی لیکن برہمنیت کے منفی اثرات کو مسترد کرتی تھی۔ انھوں نے اپنی سادہ اور عرفانی شاعری کے ذریعے کشمیری معاشرے میں سماجی اصلاحات کو فروغ دیا، خاص طور پر ذات پات کے نظام کو چیلنج کیا اور مساوات پر مبنی ایک ہم آہنگ معاشرے کی بنیاد رکھی۔

برہمنیت سے متاثر رسومات: وادی کشمیر میں برہمنیت کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ مقامی مسلمانوں میں بھی مورتی پوجا، "ویتھ ترُوَہ" جیسے غیر شرعی تہوار، مندروں کی زیارت، اور کھیر بھوانی جیسے مندروں میں نذرانے پیش کرنا عام تھا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ جہانگیر کو کہنا پڑا کہ کشمیری پنڈتوں اور مسلمانوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔[۳۸] اسی حقیقت کو ٹینڈل بسکو (Tyndale Biscoe) (۱۸۶۳ - ۱۹۴۹ء) نے یوں بیان کیا کہ کشمیر میں دین اور زندگی ایک دوسرے سے بالکل الگ اور غیر مربوط ہیں۔[۳۹] یہ جملہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ عوام کی مذہبی پہچان اور عملی زندگی میں گہرا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا، جس نے معاشرتی اصلاح کو ایک ناگزیر ضرورت بنا دیا۔ یہ رسومات اسلامی تعلیمات سے متصادم تھیں اور لوگوں کو دین کی خالص روح سے دور کر رہی تھیں۔ شیخ العالمؒ نے اپنی شاعری میں مورتی پوجا اور غیر شرعی تہواروں کو جہالت اور گمراہی قرار دیا اور واضح کیا کہ ان کا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ہو گا:

مسلمان یِم ہِندیُت پکن شکن کیاہ کرن، کیاہ کرن بوے
یقین چھُکھ کُفرُک، مسلمانی ھیکن سِینہ چھِکھ نہ صاف چھِکھ بد خویے
گُہہ یِم لِوَن تہ نعمژ چھکن تِم قیامژ دوہہ ووتھن سیاہ رویے[۴۰]

(جو مسلمان ہندوانہ طرزِ معاشرت اور غلط اسلامی رسم و رواج، اکابر اور مردہ پرستی، گروپرستی

---

(۳۸) Sender, *The Kashmiri Pandits*, p. 37.

(۳۹) Tyndale Biscoe, *Kashmir in Sunlight and Shade*, Sheeley, Service & Co. Limited, London, 1922, p. 101.

(۴۰) شاد، کلامِ شیخ العالم، ص۳۷۹؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص۳۶۶۔

وغیرہ غیر اسلامی عقیدے، جان کر اپنائیں وہ تذبذب، شکوک و شبہات اور توہمات کی مہلک بیماری میں مبتلا ہیں۔ یہ عجیب و غریب بے وقوف ہیں۔ اپنی توہم پرستی کی وجہ سے یہ لوگ کفر پر یقین رکھتے ہیں اور پھر مسلمانی پر فخر بھی کرتے ہیں لیکن ان کا ضمیر کفر و شرک اور بد خو صحبت سے مردہ اور ناصاف ہو چکا ہے۔ یاد رکھو! جو لوگ گوبر سے اپنے مکان، دہلیز، رسوئی اور چولہے کی لپائی، ان کو پاکیزہ بنانے کے خیال سے کرتے ہیں۔ وہ قیامت کے دن اپنی اپنی قبروں سے سیاہ رو اور ناکام و نامراد ہو کر اُٹھائے جائیں گے)

شیخ العالمؒ کا یہ شعر چودھویں صدی کے کشمیر کے گہرے المیے کو بے نقاب کرتا ہے۔ شیخ العالمؒ یہاں نہ صرف رائج رسوم کی مذمت کرتے ہیں بلکہ ان کے پس پردہ چلنے والے ذہنی اور روحانی زوال کو بھی آشکار کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایسے لوگ بظاہر "مسلمان" کہلاتے ہیں، مگر حقیقت میں ان کے دل کفر و شرک کے اندھیروں میں دفن ہیں۔ یہ اپنی مسلمانی پر فخر کرتے ہیں مگر ان کا یقین، ضمیر اور عمل برہمنیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس دوغلے پن کو وہ تذبذب اور شکوک کی مہلک بیماری قرار دیتے ہیں، جو انسان کو نہ صرف دنیا میں گمراہ کرتی ہے بلکہ آخرت میں بھی ذلت و رسوائی کا باعث بنتی ہے۔ قیامت کے دن کا منظر کھینچتے ہوئے وہ ان لوگوں کو خبردار کرتے ہیں کہ جو دنیا میں جھوٹی پاکیزگی کے نام پر ہندوانہ رسوم کو اپناتے ہیں، وہ اس دن اپنی قبروں سے سیاہ رو اور ناکام و نامراد اٹھائے جائیں گے۔

غیر شرعی رسومات: برہمنیت کے اثرات نے قرونِ وسطیٰ کے کشمیری معاشرے میں متعدد غیر شرعی رسومات کو جڑ پکڑنے کا موقع دیا۔ گائے کے گوبر اور پیشاب کو پاکیزگی کی علامت سمجھ کر اس کی تعظیم کرنا، ان ہی ہندو روایات کی ایک نمایاں مثال تھی۔ نیلمت پُران، جو کشمیر کی قدیم ہندو مذہبی کتاب ہے، کے مطابق پنچگاویہ، یعنی گائے کی پانچ اجزاء پر مشتمل اشیاء، جن میں پیشاب اور گوبر بھی شامل ہیں، کو مقدس غسل کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔[۴۱] یہ ہدایت اس بات کی عکاس ہے کہ قدیم کشمیری مذہبی رسومات میں گائے اور اس کی مصنوعات کو تقدس کے اعتبار سے ایک مرکزی مقام حاصل تھا۔ سلطان زین العابدین جیسے صاحبِ اقتدار حکمران نے بھی گائے کے ذبح

---

(۴۱) Ved Kumari, trans. *Nilamata Purina*, vol. 1, Jammu and Kashmir Academy of Art, Culture and Languages, 1968, p. 123.

پر پابندی عائد کی اور خود گوشت کھانے سے گریز کیا۔[۴۲] اس کے بعد سے آج تک کشمیر میں بڑے گوشت کے ذبح اور استعمال پر پابندی برقرار ہے۔[۴۳] شیخ العالم نے ان غیر شرعی رسومات کو غیر منطقی اور غیر اسلامی قرار دیا اور خاص طور پر گائے کی تعظیم سے متعلق رسومات کی تنقید کی، جو برہمنیت سے متأثر تھیں :

گُہِ لِوِنِس تہ گریمُت چینس — دودھ گیو لھینس اوم کیو زومُے
ماز ڈیشِتھ لوب کیازِ ہینس — بٹن ہُند شوژر درینٹھ کتہِ آوے[۴۴]

(گائے کے گوبر سے رسوئی اور برآمدے کی لپائی کرنے اور گائے بچھڑے کا پیشاب پینے میں اور پھر گائے کا دودھ، دہی اور گھی کھانے میں جب کوئی کراہت اور رکاوٹ نہیں تو پھر گائے بچھڑے کا گوشت دیکھتے ہی وہ دور کیوں رہتے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کو شوچ اور اشوچ کہاں سے نظر آ گیا۔ انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ حلال و حرام کی کیا عجیب و غریب پہچان ہے)

یہ شعر شیخ العالم کی فکری جرأت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں وہ کشمیری پنڈت معاشرے کے تضاد کو بے نقاب کرتے ہیں، کہ ایک طرف وہ گائے کے گوبر سے گھر کے برآمدے اور کچن کو پوتنے میں کوئی کراہت محسوس نہیں کرتے، حتیٰ کہ گائے یا بچھڑے کا پیشاب بھی بطور دوا یا تبرک پیتے ہیں، مگر دوسری طرف جب اسی گائے یا بچھڑے کے گوشت کی بات آتی ہے تو اسے "اشوچ" (ناپاک) قرار دے کر اس سے دور رہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس عمل کو "اللہ پر جھوٹ باندھنے" کے مترادف قرار دیا ہے۔[۴۵] یعنی یہ دوہرا معیار نہ وحی کی روشنی میں درست ہے اور نہ عقل اس کو تسلیم کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ وَلَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا"[۴۶]، یعنی اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔ یہ شعر اصل میں ایک

---

(۴۲) Hasan, *Kashmir Under the Sultans*, p. 86.

(۴۳) Jammu and Kashmir State Ranbir Panel Code 1989 (1932 A.D.), 298-A, 429.

(۴۴) شاد، کلامِ شیخ العالم، ص ۳۸۱؛ آفاقی، کلیات شیخ العالم، ص ۳۶۵۔

(۴۵) القرآن، ۱۶: ۱۱۶۔

(۴۶) صحیح مسلم، ۱۰۱۵۔

فکری چیلنج ہے، وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حلال و حرام کا پیمانہ قرآن و سنت ہے، نہ کہ غیر اسلامی رسومات یا سماجی دباؤ۔

بہر حال، شیخ نور الدین (شیخ العالم) کی چودھویں صدی کی شاعری کشمیر کے سماجی و دینی منظر کی عکاس ہے، جو توحید، سنت و شریعت کی پاسداری، اور غیر شرعی رسومات کی تنقید کے ذریعے عالمگیر پیغام دیتی ہے۔ ان کی صوفیانہ شاعری فطرت کی علامتوں (دریا، چراغ، کستوری) کے بارے میں دینی تصورات کو عام فہم بناتی ہے، جو آج بھی مادیت اور بدعات کے مقابلے میں توحید، سادگی، اور سماجی مساوات کی دعوت دیتی ہے۔ ریشی تحریک کے ذریعے ان کی شاعری نے کشمیری معاشرے کو بدل کر عالمگیر اصلاح کا پیغام دیا، جو قرآن و حدیث پر عمل، غیر شرعی رسومات کے ترک، اور اللہ کی رضا کی زندگی کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ شاعری آج بھی توحید کو طرز زندگی، سنت کو نجات کا راستہ، اور سماجی اصلاح کو ذمہ داری قرار دیتی ہوئی دلوں کو جھنجھوڑتی ہے۔

کتابیات

۱۔ اسد اللہ آفاقی، کلیات شیخ العالم، لائف فاؤنڈیشن، چرار شریف، ۲۰۰۸۔

۲۔ بابا داود مشکواتی، اسرار الابرار، ترجمہ: محمد طاہر بخاری، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۲۲۔

۳۔ بلجی ناتھ پنڈت، "کشمیر کی مخصوص روایت اور سماجی یکجہتی"، شیرازہ (ثقافت نمبر)، جلد ۵، شمارہ نمبر ۱، جون ۱۹۶۶۔

۴۔ جی ایم شاد، کلامِ شیخ العالم، علی محمد اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۳۔

۵۔ علی کوفی، فتح نامہ سندھ عرف چچ نامہ، ترجمہ: اختر رضوی، سندھی ادبی بورڈ، جام شورو، ۲۰۰۸۔

۶۔ غلام حسن کھویہامی، تاریخِ حسن، جلد ۲، ترجمہ: شریف حسین قاسمی، علی محمد اینڈ سنز سرینگر، ۲۰۱۳۔

۷۔ محمد اعظم دیدمری، واقعاتِ کشمیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، جموں اینڈ کشمیر اسلامک ریسرچ سینٹر، سرینگر، ۲۰۱۹۔

۸۔ محمد علی کشمیری، تحفۃ الاحباب، ترجمہ: غلام رسول جان، جلد ۲، جان پبلکیشنز، سرینگر، ۲۰۱۸۔

۹۔ محمد فاروق بخاری، کشمیر میں اسلام: منظر اور پس منظر، مکتبہ علم و ادب، سرینگر، ۲۰۱۳۔

۱۰۔ محی الدین مسکین، تاریخِ کبیر، ترجمہ: شمس الدین احمد، شیخ محمد عثمان اینڈ سنز، سرینگر، ۲۰۱۵۔

۱۱۔ موتی لال ساقی، کلیات شیخ العالم، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، ۲۰۰۹۔

۱۲۔ حاشیۃ کتاب التوحید لعبد الرحمن بن قاسم، المکتبۃ الشاملۃ۔

13. Bazaz, P.N., *The History of Struggle for Freedom in Kashmir*, Kashmir Publishing Company, New Delhi, 1954.

14. Behera, Navnita Chadha, *State, Identity and Violence: Jammu, Kashmir*

and Ladakh, Manohar Publishers and Distributors, New Delhi, 2000.
15. Biscoe, Tyndale, *Kashmir in Sunlight and Shade*, Sheeley, Service & Co. London, 1922.
16. Ernest F. Neve, *Beyond the Pir Panjal: Life and Missionary Enterprise in Kashmir*, Church Missionary Society, London, 1914.
17. Fayaz, Farooq, *Folklore and History of Kashmir*, Nuneposh Publications, Srinagar, 2001.
18. Hasan, Mohibbul, *Kashmir Under the Sultans*, Iran Society, Calcutta, 1959.
19. Jonaraja. *RÉjataranginÊ*, trans. J.C. Dutt, Gian Publishing House, New Delhi, 1986.
20. Khan, Mohammad Ishaq, *Islamic and Cultural Foundations of Kashmiriyat*, Primus Books, New Delhi, 2021.
21. Kilam, Jia Lal, *A History of Kashmiri Pandits*, S.N. Dhar, Srinagar, 1955.
22. Kumari, Ved, trans., *NÊlamata PurÉna*, vol. 1, Jammu and Kashmir Academy of Art, Culture and Languages, 1968.
23. Lawrence, Walter, *The Valley of Kashmir*, Oxford University Press, London, 1895.
24. Mattoo, Neerja, "Syncretic Tradition and the Creative Life: Some Kashmiri Mystic Poets," in *The Parchment of Kashmir: History, Society and Polity*, ed. Nyla Ali Khan, Palgrave Macmillan, New York, 2012.
25. Parmu, R. K., *A History of Muslim Rule in Kashmir*, People's Publishing House, Delhi, 1969.
26. Rafiqi, A.Q., trans., *Maktubat-i-Mir Sayyid 'Ali Hamadani*, Gulshan Publishers, Srinagar, 2007.
27. ______, *Sufism in Kashmir (from the Fourteenth to Sixteenth Century)*, Bharatiya Publishing House, Varanasi, 1972.
28. Razdan, Omkar, *The Trauma of Kashmir: The Untold Reality*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1999.
29. Sender, Henny, The Kashmiri Pandits: A Study of Cultural Choice in North India, Oxford University Press, Delhi, 1988.
30. Singh, N. K., *Inter-communal Relations in Jammu and Kashmir (1846-1931)*, Jay Kay Books, Jammu, 1991.
31. ___________, *Islamic Heritage of Kashmir*, vol. 2, Gulshan Publishers, Srinagar, 2000.
32. Wani, Mohammad Ashraf, *Islam in Kashmir*, Oriental Publishing House, Srinagar, 2004.
33. Wright, Thomas, *The Travels of Marco Polo The Venetian*, George Bell and Sons, London, 1899.

علامہ فراہیؒ کی زاہدانہ عربی شاعری

ڈاکٹر ابوذر ندوی
abuzarhateem2011@gmail.com

علامہ حمید الدین فراہی مشرقی یوپی کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ کے گاؤں پھریہا سے تعلق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ شعور آیا تو مختلف اساتذہ سے کسب فیض کیا جن میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مولانا سہارنپوری کی شخصیت کے بارے میں سید سلیمان ندویؒ لکھا ہے کہ "خاک ہند نے صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو"[1]۔ ان کا ایک عربی دیوان موجود ہے جسے علامہ فراہیؒ نے ۱۹۱۶ء میں حیدرآباد دکن سے طبع کرایا تھا[2]۔ خود علامہ فراہی کی عربی شاعری بڑی شاندار ہے۔ علامہ شبلی کو جب شمس العلماء کا خطاب ملا تو اس موقع پر عربی زبان میں ایک قصیدہ کہا تھا جو سیرت شبلی از اقبال سہیل اور حیات شبلی از علامہ سید سلیمان ندویؒ میں مع ترجمہ موجود ہے[3]۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے علامہ فراہی کی ادبیاتِ فارسی و عربی کے اعتراف میں لکھا ہے کہ انھوں نے جو کچھ پڑھا شوق سے پڑھا، اس لیے ادبیاتِ فارسی و عربی میں معاصرین سے بازی لے گئے، ممکن ہے مولانا شبلی سے بھی۔ فارسی و عربی دونوں پر بے تکلف اہل زبان کی طرح قدرت رکھتے تھے۔ فارسی میں بھی صاحب دیوان شاعر تھے، اور کلام جاہلیت کے گویا حافظ تھے۔ البتہ ان کی عربی عبارت بڑی گٹھی ہوتی تھی۔[4]

مختصر تعارف: علامہ فراہی نے تفسیر قرآن میں ایک منفرد شناخت پیدا کی ۔ وہ کثیر الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے عربی، اردو اور فارسی زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ ان کا عربی کلام

---

[1] سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۰۸، ص ۹۶

[2] ذکر فراہی از ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ ۲۰۰۱، ص ۶۲

[3] سید سلیمان ندوی، حیات شبلی ص ۲۱۲-۲۱۳۔

[4] عبد الماجد دریابادی، معاصرین، ادارہ انشائے ماجدی، رابندر سرانی کلکتہ ۱۹۷۹، ص ۱۲۲

"ديوان المعلم عبدالحميد الفراهي" کے نام سے پہلی مرتبہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ علامہ نے اپنے عربی دیوان کا نام احتیاطا "ديوان أبي أحمد الأنصاري" رکھا تھا کیوں کہ انھوں نے طرابلس اور بلقان کی جنگوں پر تیز و تند نظمیں لکھیں تو انگریزی حکومت کی سی آئی ڈی ان کے پیچھے رہنے لگی۔ اس لئے کچھ دنوں کے لیے انہوں نے ابواحمد نام اختیار کر لیا تھا۔ (۵)

مولانا فراہی کے عربی دیوان کا ایک قلمی نسخہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے کتب خانے میں محفوظ ہے جو مخطوطات نمبر ۱۸۳ پر موجود ہے۔ اس پر کاتب کی حیثیت سے مولوی عبدالباری اعظمی کا نام لکھا ہوا ہے۔ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی نے اپنی ڈائری میں علامہ فراہی کے دیوان کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ عربی نظمیں میں نے خود ان سے سنی ہیں (سمعته عنه)۔ یہ دیوان بڑا مؤثر، حوصلہ بخش اور دلوں کو گرمانے والا ہے۔ اس میں انگریزوں کی دشمنی، جنگ طرابلس اور جنگ عظیم کا تذکرہ ہے۔ (۶)

علامہ فراہی کے عربی دیوان کا ایک محقق ایڈیشن "شعر الإمام عبدالحميد الفراهي" کے نام سے دار سنابل استنبول سے ۲۰۱۹ میں چھپ چکا ہے، اس کا مطالعہ و تجزیہ ڈاکٹر محمد خالد الرہاوی اور ڈاکٹر عامر خلیل الجراح نے کیا ہے۔ (۷)

مولانا کا فارسی کلام "دیوان حمید (فارسی)" کے نام سے پہلی بار ۱۹۰۳ میں منصۂ شہود پر آیا تھا۔ اس میں دو نظمیں عربی کی بھی شامل تھیں (۸)۔ بعد میں فارسی کلام کا یہی مجموعہ "نوائے پہلوی" کے نام سے عربی نظموں کے بغیر شائع ہوا۔ ذکر فراہی کے مصنف ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم کی تحقیق کے مطابق "دیوان حمید" کا یہ نسخہ "انجمن ترقی اردو کراچی" کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس پر علامہ فراہی کی تصویر بھی ہے۔ ڈاکٹر اصلاحی کے اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ نسخہ بچشم خود دیکھا ہے۔

---

(۵) ذکر فراہی ص ۶۰-۶۱

(۶) حوالہ سابق ص ۶۲۸

(۷)

https://qspace.qu.edu.qa/handle/10576/12934?locale-attribute=ar5–
https://www.noor-book.com/en/ebook

(۸) ذکر فراہی، ص ۶۱۹

علامہ فراہی کو قرآن پاک سے خاص شغف تھا۔ قرآن ان کا مرکز و محور تھا۔اسی لیے شاعری انہوں نے بربنائے ضرورت کی ہے۔ ان کے منظوم کلام کی کمیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی کچھ چیزیں دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ مثلاً ان کے اپنے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی وفات پر کہے گئے ان کے مرثیے کا پتہ نہیں چل رہا ہے۔ اقبال سہیل کا بیان ہے کہ انہوں نے زندگی میں دو ہی مرثیے کہے، ایک اپنی پھوپھی زاد بہن کا دوسرا اپنے استاد مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا[9]۔ مولانا بدرالدین اصلاحیؒ[10] نے دیوان کے شروع میں "کلمۃ الجامع" کے عنوان سے جو پیش لفظ تحریر کیا ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ مخطوطات میں سے جو کچھ ان کے ہاتھ لگا انھوں نے شائع کر دیا۔ البتہ ان کے دوستوں یا شاگردوں میں سے کسی کے پاس مزید کچھ ہو تو ان سے درخواست ہے کہ ہمیں فراہم کر دیں۔[11]

علامہ فراہی اور بیعت: تقویٰ و للّٰہیت اور فکر معاد، اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ آخرت کی جوابدہی اور سرمدی زندگی کی فکر ہر مسلمان کے اندر ہونی چاہیے۔ صوفیہ کے یہاں اس احساس کو ہمہ وقت زندہ و تابندہ رکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے، جس کا ان کے یہاں باقاعدہ ایک منظم عملی نصاب ہوتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ علامہ فراہی الٰہ آباد کی پروفیسری کے زمانے (غالباً ۱۹۱۰) میں مولانا وارث حسن صاحب سے بیعت ہو چکے تھے۔ انہوں نے علامہ شبلیؒ کی طرف بھی دست بیعت بڑھایا تھا مگر علامہ شبلی نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی۔[12]

اس مضمون میں علامہ فراہی کی زاہدانہ شاعری کے ساتھ ساتھ ابوالعتاہیہ کے اشعار بھی کہیں کہیں آ گئے ہیں، دونوں کا موازنہ مقصود نہیں، البتہ زہد کا رنگ دونوں کے یہاں پایا جاتا ہے،

---

[9] حوالہ سابق ص ۱۰۱

[10] مولانا بدرالدین اصلاحیؒ مولانا فراہیؒ کے علمی سرمایے کے محافظ ہونے کے ساتھ ماہر فراہیات بھی تھے۔ جب انہوں نے مولانا فراہیؒ کی چند کتابیں مرتب کر کے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی خدمت میں ارسال کیں تو انہوں نے ان کی صلاحیت کو اپنے ایک مکتوب میں یوں سراہا: "کل کتاب اور آج ملفوف موصول ہوا۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کے ان کارناموں کو دیکھ کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اس خدمت کی سعادت آپ ہی کے لیے مقسوم تھی۔ میں اور برادر محترم دونوں اس سے محروم رہے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ہاتھوں اس کام کو تکمیل تک پہنچائے۔ بہت بڑی خدمت ہے۔ آئندہ نسلیں آپ کی ممنون ہوں گی" (سالانہ مجلہ طلبۂ مدرسۃ الاصلاح ۱۹۹۶، مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر، ص ۶۹)۔

[11] کلمۃ الجامع از دیوان المعلم، عبدالحمید الفراہی، طبع ثانی ۱۹۸۹، کوثر پریس، سرائمیر اعظم گڈھ، ص ۷

[12] سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۶۳۰

اس لیے کہیں کہیں موازنے کی جھلک آگئی ہے۔ ایک بڑا واضح فرق دونوں کے کلام میں یہ ہے کہ ابوالعتاہیہ کے یہاں دنیا، دنیا کا فریب، سراب، اخلاص کا فقدان، قبر، عذاب آخرت اور انہیں جیسے مضامین کی تکرار ہے۔ مگر علامہ فراہی کی شاعری کا نصف سے زائد حصہ طاقتور ملکوں کی چیرہ دستی، ان کی مکارانہ سیاست اور غاصبانہ طبیعت کی روداد بیان کر رہا ہے۔ مولانا نے استعمار کے خلاف گویا علمی جہاد کیا ہے، مسلم ملکوں کو غیرت دلائی ہے اور انہیں للکارا ہے۔

عربی دیوان پر ایک نظر: علامہ کے عربی دیوان میں پندرہ عنوانات کے تحت کل ۲۹۰ اشعار ہیں۔ عنوانات میں استعاذہ "فی غفلۃ الإنسان"، "فی تقلب الأیام بالناس" وغیرہ ہیں۔ ان عنوانات کے تحت جو اشعار ہیں وہ ان نظموں کے اشعار کی بہ نسبت کم ہیں جو جنگوں کے تعلق سے ہیں۔ سب سے زیادہ اشعار "فی ذکر الملحمۃ الکبریٰ" والی نظم میں ہیں۔ " فی ذکرالملحۃالکبریٰ "۴۲/ اشعار پر مشتمل طویل ترین نظم ہے۔ زیر نظر مضمون میں دیوان کی ابتدائی چار نظموں کے متعلق بات کی گئی ہے۔ جنگ بلقان وطرابلس، عالم عیسائیت کی تیاری، عربوں کی صلح، اور اس صلح پر علامہ کی مذمت نیز دیگر موضوعات پر کہے گئے اشعار کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

دیوان میں استعاذہ کے بعد دو عنوانات "فی غفلۃ الإنسان" اور "فی تقلب الأیام بالناس" میں زہد، پرہیزگاری، دنیابیزاری، انسانی زندگی میں اتار چڑھاؤ، آخرت کے سفر اور اس سفر پر جانے والے مسافروں پر گزرنے والے حالات اور ان حالات کے اہل زمین تک نہ پہنچنے کے اسباب پر تجاہلانہ قیاس، نیز ان کے انجام کے تعلق سے تشویش ظاہر کی گئی ہے۔ قصیدہ "فی غفلۃ الإنسان" بڑے مؤثر انداز میں یوں شروع ہوتا ہے:

أما للناس أحلام　　　أهم فِي السكر نوام
وهم وراد حوض المو　　　ت إصرام فإصرام [۱۳]

(کیا لوگوں کو عقل نہیں یا وہ نشے میں سو رہے ہیں۔ جب کہ لوگ جماعت در جماعت موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں)

اگلے اشعار میں دوست، بھائی، باپ، چچا اور اقرباء کے کام نہ آنے کا ذکر کرنے کے بعد زندگی کے فریب اور موت کی سچائی کی تشبیہ چوپایوں کی ڈھیلی چھوڑی گئی رسی سے دیتے ہیں جس میں

---

(۱۳) دیوان المعلم، عبدالحمید الفراہی، ص ۱۰

مقابل کا اسلوب سامنے رکھنے سے بات بخوبی واضح ہوتی ہے۔

فحبل الموت ممدود وحبل العيش إرمام
وهم باللهو واللذا ت مشغولون ما داموا [۱۴]

(موت کی رسی لمبی اور مضبوط جب کہ زندگی کی ڈور تنگ اور کمزور ہے اور لوگ مستقل لہوولعب میں پڑے ہوئے ہیں)۔

علامہ فراہی جب انسان کی حیثیت، دنیا کی بے ثباتی، گردش لیل ونہار اور آخرت سے غفلت پر بات کرتے ہیں، تو ان کی شاعری میں ابوالعتاھیہ کا رنگ آجاتا ہے۔ مثلاً "حوض الموت" کا لفظ ابوالعتاھیہ نے بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

الموت حوض لا محالة دونه مر مذاقته كريه مشربه (۱۵)

(موت وہ حوض ہے جس پر بہرصورت اترنا ہے اس کا پانی پینے میں تکلیف دہ اور ذایقے میں تلخ ہے)

علامہ انسانی زندگی کی حقیقت اور اس کے سرد وگرم کے بارے میں کہتے ہیں:

العيش إحلاء وإمرار والدهر إقبال وإدبار
بينا الفتى يرفل فى ثروة أذنابه بؤس وأقتار [۱۶]

(زندگی تلخ وشیریں تجربات کا نام ہے اور زمانہ اقبال وادبار سے عبارت ہے۔ انسان عیش وعشرت میں زندگی گزارتا ہے مگر (کبھی کبھی) زندگی کے آخری ایام بڑی کس مپرسی اور فاقہ مستی میں گزرتے ہیں)۔

ابوالعتاہیہ اسی مضمون کو یوں باندھتا ہے:

يا أيها المبتلى بهمته ألم تر أن الدهر كيف ينقلب [۱۷]

(اے اسیر ہوا وہوس، دیکھتے نہیں کہ زمانہ کیا کیا رنگ دکھاتا ہے!)

دوسری جگہ کہتا ہے:

---

(۱۴) حوالہ سابق ص ۱۰

(۱۵) دیوان ابی العتاھیہ، دار بیروت للطباعۃ والنشر، بیروت ۱۹۸۶ ص ۵۹

(۱۶) دیوان المعلم، ص ۱۱۔ دوسرے ایڈیشن میں "اَقطار" چھپا ہے لیکن پہلے ایڈیشن میں "اقتار" ہے جو سیاق کے لحاظ سے مناسب ہے۔

(۱۷) دیوان ابی العتاھیۃ، ص ۵۷

حلاوتہا ممزوجۃ بمرارۃ وراحتہا ممزوجۃ بعناء [۱۸]

(دنیا کی شیرینی بھی تلخی آمیز ہوتی ہے، اس کے آرام میں بھی دکھ اور مشقت شامل ہوتی ہے)۔

اسی بات کو علامہ فراہی اپنے دیوان میں اس طرح ادا کرتے ہیں:

فلا یرجعن إلا إلی الضر نفعھا ولا یرجعن إلا إلی الشح جودھا

فسیّان عندی عدمھا و وجودھا وصنوان عندی وصلھا وصدودھا [۱۹]

(اس کا فائدہ بھی گھاٹا بن کر لوٹتا ہے، اس کی فیاضی بخیلی کے سوا کچھ نہیں۔ میری نظر میں اس کا ہونا نہ ہونا برابر، نیز اس کا ملنا یا اعراض کرنا یکساں ہے)

علامہ فراہی دنیا کی بے وفائی اور سانسوں کی بے ثباتی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو آخری سفر میں مٹی اور پتھر کو اوڑھنا بچھونا بنانا پڑتا ہے:

وبینما المرءُ مقیم إذا جشمہ للبین أسفار

وکم رخِی العیش فِی قصرہ یفعمہ مسک وأزھار

إذ رفع النعش لہ بغتۃ فضمہ ترب وأحجارُ [۲۰]

(انسان دنیا میں رہتا ہے لیکن اچانک اسے سب کچھ چھوڑ کر آخری سفر پر جانا پڑتا ہے۔ کتنے ہی لوگ ہیں جو اپنے محلوں میں نازو انداز سے پلتے ہیں، معطر فضا میں سانس لیتے ہیں اور جب ان کا لاشہ آخری سفر کے لیے اٹھایا جاتا ہے تو مٹی اور پتھر اسے اپنے اندر ضم کر لیتے ہیں)۔

ابو العتاھیہ کہتا ہے:

ألم تر ریب الدھر فی کل ساعۃ لہ عارض فیہ المنیۃ تلمع [۲۱]

(گھڑی گھڑی بدلتے زمانے کا رنگ اور اس کے مصائب سے عبرت نہیں پکڑتے کہ اس کے بادل میں موت کا کوندا ہوتا ہے)

من تراب خلقت لا شک فیہ وغدا أنت صائر للتراب [۲۲]

(اس میں کوئی شک نہیں کہ تم مٹی سے بنے ہو اور کل مٹی میں مل جاؤ گے)

دوسری جگہ کہتا ہے:

---

[۱۸] حوالہ سابق ص ۱۲

[۱۹] دیوان المعلم، ص ۳۶

[۲۰] حوالہ سابق ص ۱۱

[۲۱] دیوان ابی العتاھیہ، ص ۲۴۷

[۲۲] حوالہ سابق، ص ۵۵

ما زالت الدنيا منغصة　　لم يخل صاحبها من البلوىٰ
دار الفجائع والهموم ودا　　ر البؤس والاحزان والشكوىٰ
بينا الفتى فيها بمنزلة　　إذ صار تحت ترابها ملقىٰ [۲۳]

(دنیا انسان کی زندگی کو مکدر کرتی رہتی ہے۔ جب تک زندگی ہے مصیبتوں سے چھٹکارا نہیں۔ یہ مصیبتوں، پریشانیوں کا گھر، بدحالیوں، غموں اور شکایتوں کی آماجگاہ ہے (اس کا حال یہ ہے کہ) انسان یہاں کسی مرتبے پر فائز ہوتا ہے اور اچانک مٹی میں دبا دیا جاتا ہے)

مولانا فراہی کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ آخرت کی زندگی کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور قبر کے بعد والی منزل کی بات بھی کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں:

يا معشر الأمواتِ يا ضيفان تر　　ب الأرض كيف وجدتم طعم الثرىٰ
أهل القبور محا التراب وجوهكم　　أهل القبور تغيرت تلك الحلىٰ
أهل القبور لا تواصل بينكم　　من مات أصبح حبله رث القوىٰ [۲۴]

(اے خفتگانِ خاک، اے زمین کی مٹی کے مہمانو! تمہیں مٹی کا ذائقہ کیسا لگا؟ اے قبر والو! مٹی نے تمہارے چہروں کو مٹا دیا، اے قبر والو! ان زیوروں کی چمک جا چکی ہے، تمہارا آپس میں کوئی ربط ضبط نہیں رہا جس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اس سے تعلق ختم ہو جاتا ہے)

علامہ فراہی "إذ رفع النعش له بغتة --- فضمه ترب وأحجار" سے آگے بڑھ کر قصیدے کے آخری چند اشعار میں قاری کی فکرِ آخرت کو مزید ابھارتے ہیں۔ وہ آگے نکل جانے والوں کے انجام پر بڑی تشویش ظاہر کرتے ہیں اور بین السطور یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی کسی کے کام نہیں آسکتا۔ اخیر میں "في الذاهبين الأولين من القرون لنا بصائر" کے مفہوم کا شعر کہہ کر اس نظم کو ختم کرتے ہیں:

ما بال أتراب لنا قطعوا　　عنا حبال الود إذ ساروا
هل شُغلوا عنا فلم يخبروا　　عن نبأ أم سد أخبارُ
هل بلغوا ما كان مقصدهم　　أم عن سبيلِ القصد قد جاروا
فهل أناخوا فِي ذرىٰ غبطة　　فيها لهم ظل وأنهار
أرضاهم الرب فزكا هم　　عن ذنبهم فالرب غفار
أم ضلت الركب فخم لهم　　ويل فوادى الغيي فالنار
فيمن مضى و قد قضى نحبه

[۲۳] حوالہ سابق، ص ۲۲-۲۳
[۲۴] حوالہ سابق، ص ۲۸

للمرء تفكير و إنذار [۲۵]

(یاروں کا کیا معاملہ ہے! یہاں سے گئے تو دوستی اور محبت کے سارے تعلقات ختم کر لئے۔ آیا وہ ہمیں بھول کر ایسے مصروف ہوئے کہ احوال سے آگاہ تک نہ کیا، یا کہ حالات سے آگاہی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ کیا وہ منزل مقصود پر پہنچے یا راستہ بھٹک گئے۔ آیا انھوں نے کسی پر لطف مقام پر پڑاو ڈالا ہے جہاں سائے اور ندیاں ان کی دسترس میں ہیں؟ یا اللہ نے انہیں شادکام کیا اور انہیں گناہوں سے پاک کیا۔ اللہ تو بہت معاف کرنے والا ہے۔ یا کہ قافلہ بھٹک گیا اور لوگوں کے لیے تباہی مقدر ہو چکی۔ وادیٔ ضلال پھر آگ ان کا ٹھکانہ ہے؟ جنہوں نے اپنی مدت حیات پوری کی اور یہاں سے رخصت ہوئے ان کے معاملات میں انسان کے لیے سامان فکر اور متاع آگہی ہے)

"في نور الحكمة والايمان" کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں علامہ نے قرآن کی بلاغت حکمت اور نصیحت کا ذکر کر کے کہا ہے کہ اس سے وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جن کی فطرت فساد سے پاک ہو۔ اس کی مثال بارش کے جیسی ہے کہ وہ نفع بخش اور ضرر رساں دونوں ہوتی ہے۔ یعنی شیخ سعدی کے لفظوں میں :

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست در باغ لالہ روید و در شورہ بوم وخس

علامہ کہتے ہیں:

يعمىٰ به الغاوي و يهدي به عبد على نهج الهدىٰ ساع
كالمزن فيه البرق والودق و الاظلام ضرار ونفاع [۲۶]

(ہوائے نفس کا پرستار اس سے مزید اندھا ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہدایت اس شخص کو ملتی ہے جو اس راستے پر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی مثال بدلی کی سی ہے کہ اس میں بجلی، پانی اور تاریکی ایک ساتھ ہوتی ہے، وہ بیک وقت نفع بخش اور ضرر رساں دونوں ہوتی ہے)

دیوان کی مذکورہ دونوں نظموں ("في غفلة الإنسان" اور "فِي تقلب الأيام بالناس") سے "في نور الحكمة والايمان" کے عنوان والی نظم کا ربط یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن کریم سارے اضطرابات کا جواب، غافلوں کے لیے انذار اور گردشِ زمانہ کا شکار ہو جانے والوں کے لیے ابدی زندگی کی

---

(۲۵) دیوان المعلم، ص ۱۲

(۲۶) حوالہ سابق ص ۱۳

بشارت ہے۔ نظم کا باقی حصہ، اس کی تشبیہ و تمثیل اور بیشتر الفاظ قرآن کریم کی سورہ نور (آیت ۳۵ تا ۴۰) سے ماخوذ نیز انھیں کا شعری جامہ ہے۔ اس نظم کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: شروع کے چار اشعار قرآن کی تعریف میں ہیں۔ پھر دوسرے حصے میں ایمان کی بات شروع ہوئی ہے یعنی قرآن اور ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ ایمان کی مثال چراغ سے دی ہے۔ یہ چراغ، چراغ کا طاق، اس میں استعمال ہونے والا ذرا سی لو پر جل اٹھنے کو تیار خالص روغنِ زیتون اور نورِ فطرت پر نور ایمانی کا سہاگہ، یہ ساری تعبیریں اور تشبیہیں قرآن سے ماخوذ ہیں۔

قصیدے کا تیسرا حصہ کفار کے اعمال اور ان کے اعمال کے ثمر بار نہ ہونے کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ اسے سراب سے تشبیہ دی ہے۔ پیاسا اس کی طرف پانی کی امید میں بھاگا بھاگا جاتا ہے، قریب پہنچتا ہے تو فریب کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہ تشبیہ بھی قرآن سے ماخوذ ہے۔ علامہ اسے شعر کا جامہ پہناتے ہوئے گویا ہیں:

ومثل الكفار أعمالهم	كيلمع [۱] رقرق بالقاع
يحسبه الظمآن ماء فيأ	تيه بإهراع و إيضاع
حتى إذا ما جاءه لم يجد	شيئاً سويا غير خداع [۲۷]

(کفار کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے وسیع و عریض میدان میں سراب جھلملاتا ہو۔ پیاسا اسے پانی سمجھتا ہے اور بھاگا بھاگا آتا ہے۔ جب اس کے پاس پہنچتا ہے تو سوائے فریب کچھ نہیں ملتا)

قصیدے کا چوتھا حصہ کفر کی تاریکیوں کے بارے میں ہے کہ وہ سننے اور سمجھنے کی صلاحیتوں پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ صلاحیتیں ابھر نہیں پاتیں، ان پر تہ بہ تہ اتنے دبیز پردے پڑ جاتے ہیں کہ طبعی روشنی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔ اس چوتھے حصے کی تعبیریں اور تشبیہیں بھی قرآن سے ماخوذ ہیں:

و مثل الكفر عماياته	غطت على قلب وأسماع
كظلمات البحر هاجت به	الأرواح من هو جاء زعزاع
يقمص بالفلك على لجه	دفاع موج بعد دفاع
فالجو في ظلماء حالكة	والقلب في الغماء والهاع
من أخرج الكف ليبصرها	لم يرها، ماذا بمستطاع

---

۱ "یلمع" اسم ہے بمعنی سراب اور ایسے بادل کی بجلی جس سے بارش نہیں ہو رہی ہو۔

(۲۷) حوالہ سابق ص ۱۳-۱۴

وظلمات بعضها فوق بعض

طبقت ليست بشعشاع [۲۸]

(کفر کی گمراہیاں سننے اور سمجھنے کی صلاحیتوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔اس پردے کی مثال ایسی ہے جیسے سمندر کی تاریکی ہو اور اس میں تیز و تند ہواؤں سے خوب لہریں اٹھ رہی ہوں۔ایسے میں کشتی کو موج کے تھپیڑے بیچ سمندر میں ادھر سے ادھر لیے پھر رہے ہوں۔ فضا میں بھی گھٹاٹوپ اندھیرا ہو، دل شدید مصیبت اور گھبراہٹ میں مبتلا ہو۔ اتنا بے بس ہو کہ انسان کو اپنا ہاتھ نہ سوجھتا ہو۔ تاریکیاں اس طرح تہ بہ تہ چھاگئی ہوں کہ چھٹ نہ سکتی ہوں)

علامہ فراہی کی شاعری شعر برائے شعر گفتن نہیں تھی۔ وہ ایک عملی انسان تھے۔ ان کی زاہدانہ شاعری ان کی زندگی اور اعمال واطوار کی سچی غماز ہے۔ ان کے معاصرین ان کے زہد اور تقوی کے چشم دید گواہ ہیں۔ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

سب سے زیادہ خاص چیز جو میں نے مولانا میں محسوس کی، یہ ان کا وہ اثر تھا جو ان کی صحبت میں بیٹھنے والے پر پڑتا تھا۔ آدمی ان کے پاس بیٹھ کر فی الواقع دنیا اور دنیا کی تمام دلچسپیاں بھول جاتا تھا۔ خدا کا بھروسہ طبیعت پر اس قدر غالب آجاتا کہ وہ ساری مشکلیں جن سے ابھی گردن ٹوٹی جاتی تھی ان کے پاس بیٹھتے ہی ایسا محسوس ہونے لگتا کہ وہ پرِ کاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں رکھتیں۔ خدا کی محبت اور آخرت کی طلب کا دل میں ایسا جوش ابھرتا کہ آدمی کو اپنی غفلت کی ساری زندگی سے نفرت ہو جاتی [۲۹]

اسی طرح علامہ شبلی مولانا فراہی کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ”حمید کے پاس بیٹھ کر آدمی کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے“[۳۰]۔ ایک جگہ مولانا عبد الماجد دریابادی نے مولانا فراہی کی نسبت لکھا ہے کہ ”مولانا کی عبادت اور مذہبیت دونوں قابل دید تھی۔ نماز کا اول وقت میں جو اہتمام رکھتے، ایسا اہتمام میں نے ایک ہی جگہ اور دیکھا ہے اور وہ حضرت اکبر الہ آبادی کے یہاں تھی۔ مولانا خود ہی سرگرم نمازی نہ تھے، دوسرے بھی ان کی ہیبت سے نمازی بن جاتے۔ جب تک مولانا کا قیام رہتا، احاطہ دار المصنّفین کے اندر نماز کا خوب چرچا رہتا“۔ [۳۱]

---

[۲۸] حوالہ سابق ص ۱۴

[۲۹] امام حمید الدین فراہی، تفسیر نظام القرآن، دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، ۱۹۹۴، ص ۲۰

[۳۰] حوالہ سابق ص ۲۰

[۳۱] عبد الماجد دریابادی، معاصرین، ص ۱۲۲

نعوت و مناقب میں ہندوستانی زبانوں کا استعمال

ڈاکٹر محمد احمد نعیمی، اسسٹنٹ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی
manaeemi@jamiahamdard.ac.in
ڈاکٹر سید محمد فضل الرحمن، اسسٹنٹ پروفیسر ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی
mfr@jamiahamdard.ac.in

زبان فکر اور خیال کو دوسروں پر ظاہر کرنے کا اہم وسیلہ ہوتی ہے۔ انسان اپنی بات کو اشاروں کے ذریعے بھی دوسروں تک پہنچا سکتا ہے مگر اس طرح اظہارِ خیال ممکن نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ تبادلۂ خیال اور اپنی فکر کی ترجمانی کے لیے زبان اشد ضروری ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ مذہب اور علم کو بھی اپنی تبلیغ و ترسیل اور ترقی کے لیے زبانوں کی لازمی طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہے کہ زبانوں کا کسی خاص دین، خاص مذہب، یا خاص دھرم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی زبانیں کسی دین یا مذہب کی اجارہ داری یا متابعت قبول کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر عہد اور ہر ملک میں بہت سے صوفیا، علما، ادبا اور شعرا نے بلا لحاظ مذہب و ملت دنیا کی مختلف زبانوں میں اپنی نگارشات اور ادبی تخلیقات سے کتب و رسائل کو زینت بخشی۔ ہمارے وطنِ عزیز میں بھی ہزاروں اہلِ علم و فن اور دانشورانِ شعر و سخن نے بلا امتیاز مذہب و ملت فارسی، اردو، ہندی، ہندوستانی اور علاقائی زبانوں میں اپنی علمی صلاحیتوں اور ادبی مہارتوں کے گلدستے سجائے ہیں اور یہ تاثر دیا ہے کہ زبانیں زندہ اقوام کی شناخت و پہچان اور ملک و وطن کی علامت و شان ہوتی ہیں۔

جب بھی کوئی زبان یا کوئی قوم کسی دوسری زبان یا دوسری قوم سے قربت اختیار کرتی ہے تو ایک دوسرے کے باہمی اثرات سے ضرور متأثر ہوتی ہے۔ ہندی اردو اور ہندوستانی زبانیں چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم نتیجہ ہیں اس لیے یہ اپنے روزِ اول سے ہی ایک دوسرے کے بہت قریب رہی ہیں اور اس کا یہ اثر ہوا کہ ہندی زبان کے الفاظ، بھجنوں کے اسالیب و رموز، تشبیہات و استعارات اور دلی جذبات و کیفیات کی جلوہ گری نعوت و مناقب میں بھی ہونے لگی اور

اس طرح صنفِ نعت و منقبت کی ہیئت اس جہت سے بھی وسعت سے ہمکنار ہوئی۔ اور پھر ہندی گیت، چھند، دوہے، راگ اور بھجن وغیرہ کے روپ میں بھی دانشورانِ شعر و سخن بارگاہِ رسالت مآب ﷺ اور دیگر اکابرینِ اسلام کے حضور منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے لگے۔ بالخصوص صوفیاء کرام نے اس مشترکہ زبان اور اسلوب کو اپنی تعلیمات کے افہام و تفہیم اور نبیٔ اکرم ﷺ سے قلبی عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے خوب خوب فروغ بخشا اور تعلیماتِ نبوی ﷺ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے عوامی زبان کا کثرت سے استعمال کیا۔

آیئے اب ان عظیم شخصیات کی طرف چلتے ہیں جو اردو، ہندی، ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے مابین ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ایک طرف اردو ادب کی تاریخ ان کے ذکرِ جمیل کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی ہے تو دوسری طرف ہندی اور ہندوستانی ادب میں بھی ان کی خدمات سے روگردانی نہیں کی جاسکتی ہے۔ مثلاً حضرت امیر خسرو کا کلام ملاحظہ فرمائیں:

رینی چڑھی رسول کی سو رنگ مولیٰ کے ہاتھ
جس کے کپرے رنگ دیئے سو دھن دھن وا کے بھاگ
خسرو باجی پریم کی میں کھیلوں پی کے سنگ
جیت گئی تو پیا مورے ہاری پی کے سنگ
خسرو دریا پریم کا، الٹی باکی دھار
جو اترا سو ڈوب گیا، جو ڈوبا سو پار
گوری سووے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھو دیس
خسرو مولیٰ کے روٹھتے، پیر کے سرنے جائے
کہے خسرو پیر کے روٹھتے، مولیٰ نہیں ہوت سہائے

شیخ شرف الدین المعروف حضرت بو علی شاہ قلندر پانی پتی بھی ہندی زبان میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور علاقائی زبان کے علاوہ ہندی ادب پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔ آپ کے کئی دہرے آج بھی زبان زدِ خلائق ہیں۔ مثلاً:

گھونگھٹ کھول بدن حسین مکھ دیکھن دے موہے
ناتر نعرہ ماروں جو سب جگ دیکھے تو ہے
پنڈت ریکھا باج کر پوتھی پانی پور
سگرے انچھر میٹ کر من میں سائیں لوڑ
پوتھی بھی تھوتھی پنڈت بھیا نہ کوئے
اکو انچھر پریم کا بڈھے سو پنڈت ہوئے

اسی طرح ایک بار ایک مفتی امام صاحب کو ”لا صلوٰۃ الا بحضور القلب“ کی نصیحت فرماتے ہوئے کہا:

آنکھیں گھاٹی گورو وہاوے
ایہہ نماز شرفا نہیں بھاوے(۱۲)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۳ء-۱۳۷۰ء) طبقۂ صوفیا میں اپنا ایک منفرد و نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ہندی بھاشا اور پوربی زبان کے بھی کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً ان کا حسب ذیل کلام ملاحظہ فرمائیں:

کالا ہنس نہ ملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے یکہ ہرے نرمل کرے سریر
درد رہے نہ پیر(۱۳)
شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے
گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے(۱۴)

حضرت گیسو دراز بندہ نواز صاحبِ علم و فضل اور صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ اکثر طلبہ اور مریدوں کو حدیث، تصوف اور سلوک کا درس دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی کلام و فقہ کی بھی تعلیم دیا

(۱۲) شیخ محمد عطا نظامی و شیخ حبیب اللہ مظہر نظامی، مفتاح الغیب شرح دیوان بو علی قندر، سیالکوٹ، دارالکتب نظامیہ قلندریہ، ۱۹۳۳ء، ص ۲۱-۴۲۔

(۱۳) حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۴۶۔

(۱۴) ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاء کرام کا کام، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ب۔ت۔ ص ۱۷-۱۸

کرتے تھے اور جو لوگ فارسی سے ناواقف تھے ان کی افہام وتفہیم کے لیے ہندی زبان میں تقریر فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی ادبی تخلیقات میں ہندی اور علاقائی دونوں زبانوں کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ مثلاً:

او معشوق بےمثال نورِ نبی نہ پایا
اور نورِ نبی رسول کا میرے جیو میں بھایا
ابلیس اپیں دیکھا ونے کیسی آرسی لایا
کرو سکلا دل گیان کا انعام دے خوش دھیان کا
چارا کھلا ایمان کا رکھ باندھ اپنے دارتوں
شہباز حسینی کھوئے کر ہر دو جہاں دل دھویکر
اللہ آپے یک ہوئے کرتب پاوے گا دیدار توں[۱۵]

شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۱۴۵۵ء- ۱۵۳۸ء) سلسلۂ صابریہ کے مشہور بزرگ اور صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں۔ آپ ہندی کے شاعر تھے اور "الکھ داس" تخلص فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی تصنیف "رشد نامہ" میں تصوف اور وحدت کے وجود کے نکات بیان کرتے ہوئے جگہ جگہ ہندی دوہرے بھی ذکر فرمائے ہیں۔ جیسے:

یہ جگ نا ہیں باج پی بوجھ برہم گیان
سو پانی سو بلبلا سوئی سرور جان
ایکی اوہو ایکی ماں ایکی سرور ایکی ہانس
گر مکھ بوجھ برہم گیان تیں ترلوک ایک کے جان
دھن کارن پی آپ سنوارا
بن دھن سکھی کنست کنہارا
شہ کھیلے دھن ما نہیں ایواں
باس پھول مہنن اچھے جیواں

---

[۱۵] ماخذ سابق، ص۲۱-۲۲۔

کیوں نہ کھیلوں تجھ سنگ میتا
مجھ کارن تیں ایتا کیتا
الکھ داس آکھے سن ہوئی
سوئی پاک ار تہ پہن ہوئی[۱۶]

مذکورہ بالا صوفیاء کرام و علماء کے علاوہ شیخ بہاؤالدین باجن، شیخ خوب محمد چشتی، شیخ برناوی جیوگاہ، محبوب عالم عرف شیخ جیون، مولانا محمد افضل جھنجھانوی، شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ محمد فاضل الدین بٹالوی، شیخ محمد نور، غلام قادر شاہ، محمد غوث بٹالوی، وارث شاہ، شیخ مراد شاہ، پیر سکندر شاہ امدادا اور رحمت شاہ جیسے بہت سے حضرات نے ہندی اور علاقائی زبانوں میں بھی بکثرت طبع آزمائی کی ہے۔[۱۷]

مرادآباد کے مشہور روحانی درویش، صوفی بزرگ حضرت شاہ بلاقی، علیہ الرحمۃ والرضوان، جن کا آستانہ آج بھی گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، نے بھی فارسی اور اردو کے ساتھ خالص ہندوستانی رنگ وآہنگ میں اپنے روحانی خیالات اور قلبی واردات کی دوہوں کی شکل میں ترجمانی کی ہے:

مرنے سے سب جگ ڈرے پنچھی اور سب جیو
بولا سن نہجو بہیو مرے ملت ہیں پیو
بولا بھولا کیا پھرے من کو کیے اداس
سائیں من میں یوں بسیں جیوں پھولن میں باس
بولا بھولا کیا پھرے اب بھی تو ٹک چیت
بن جوتے بن باہ دیئے، بیج نہ بوت کھیت
سارن برہمن موہ ملی کرتے اپنا کاج
اوہ اکہٹ ہوں یوں سنے لیو پی آج پیاج[۱۸]

---

[۱۶] ماخذ سابق، ص۲۸-۲۹؛ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، ص۱۶۱۔
[۱۷] محمود خاں شیرانی، پنجاب میں اردو، لاہور، انجمن ترقی اردو۔ ص:۱۴۷۔۳۰۱
[۱۸] ڈاکٹر محمد آصف حسین، مرادآباد کے غیر مسلم شاعر، ص۲۱-۲۲۔

صوفی سنتوں کا کام خدمتِ خلق اور انسانی بھائی چارہ اور ہندو مسلم اتحاد تھا۔ ان کا سندیش تھا کہ تمام مسلم اور غیر مسلم اقوام کو ایک قوم کی حیثیت سے معاشرتی و سماجی زندگی بسر کرنی چاہیے اور انسانیت، محبت اور باہمی ہمدردی کا جذبہ ایک دوسرے کے تئیں رکھنا چاہیے۔ نیز لسانی و تہذیبی یگانگت، سنجیدہ زبان، شائستگیٔ بیان اور آپسی میل جول کی متحد ہو کر کوشش کرنی چاہیے کیونکہ یہی صوفیا کی تعلیم کا اصل نصب العین ہے اور یہی انسانیت و روحانیت کا لب لباب ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال نے ہندی اور ہندوستانی الفاظ کو شعری جامہ پہناتے ہوئے اس پیغام کو واضح کیا ہے:

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریم میں ہے[۱۹]

اس تعلق سے محسن کاکوروی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے مشہور نعتیہ قصیدے "مدیح خیر المرسلین" میں نہ صرف ہندی، ہندوستانی اور علاقائی زبان کا برملا استعمال کیا ہے بلکہ ہندو دھرم اور ہندوستانی تہذیب کی بہت سی اصطلاحات کو بھی انتہائی اچھوتے انداز میں نظم کیا ہے:

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی
کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
اب کے میلا تھا ہنڈولے بھی گرداب بلا
نہ بچا کوئی محافہ، نہ کوئی رتھ نہ بہل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے

---

[۱۹] پروفیسر حسین احمد، اکیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ، خانقاہ دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ، ۲۰۱۹ء، ص ۱۴۵

نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
دو بالا کیے دیتے ہیں ہوا کے جھونکے
بیڑے بھادوں کے نکلتے ہیں بھرے گنگا جل
جوگیا بھیس کیے چرغ لگائے ہے بھبھوت
یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمبل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں
تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل
خوب چھایا ہے سرِ گوکل و متھرا بادل
رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
ہوا مبعوث فقط اس کے مٹانے کے لیے
سیفِ مسلولِ خدا نورِ نبیٔ مرسل
مہرِ توحید کی ضو اوجِ شرف کامہ نو
شمعِ ایجاد کی لو بزمِ رسالت کا کنول

یہ اپنی نوعیت کا منفرد قصیدہ ہے کہ جس میں ہندوستانی ماحول و تہذیب کا منظر ہندی الفاظ میں بہت ہی بے تکلفی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستانی ادب میں ایسے دانشورانِ شعر و سخن کی ایک طویل فہرست ہے کہ جنھوں نے اردو نعتوں اور منقبتوں میں ہندی الفاظ و اصطلاحات، تلازمات و مناسبات اور استعارات و تشبیہات کا بڑے حسین پیرائے میں استعمال کیا ہے۔ اگرچہ اردو اور ہندی کی بحروں میں کئی حیثیت سے نمایاں فرق ہے لیکن اس کے باوجود ہندی، ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ان حضرات نے ہندوستانی زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو سلیقے سے استعمال کیا ہے اور ہندوستانی تہذیب اور ماحول کی اتنی عمدہ عکاسی کی ہے کہ کلام کا حسن دوبالا اور انتہائی جاذب و دلکش ہو گیا ہے۔ بابا چھیٹو داس بارگاہِ رسول میں اپنی عقیدت کا خراج پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نام محمد آس بڑی ہے اب تیرے نام کی ٹیک پڑی ہے
جہاں جھرنا و ندی گہری اوگاہ اتھاہ میں آن پھنسی ہے
کھیون ہار بنا پتوار کہاں سے کہوں گہنوں کی سری ہے
نام محمد آس بڑی ہے اب تیرے نام کی ٹیک پڑی ہے
چار ہو تو پار اتارو تمرے نکچ نہ یہ بات بڑی ہے
چھیتو داس کی عرضی یہی اب پار کرو مری ناؤ اڑی ہے[۲۰]

دھرما مراؤ اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

نین پسارے دیکھا سب جگ
تمھیں ہو دوسر نہیں اور
پیا اِک با دیکھو نینن کی اور
کب دیہو درشن پیا محمد موہے
یہ ہی نس دن گور
پیا اِک بار دیکھو نینن کی اور
جاکو پیا چاہے تاہی سہاگن
دھرما کا ہو کیر نہور
پیا اک بار دیکھو نینن کی اور[۲۱]

سنت کبیر داس محمد ﷺ کی عظمت و انفرادیت کو شعری قالب میں ڈھالتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایسی مہان ہستی ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں اس کے جلوے نظر آتے ہیں:

عدد نکالو ہر چیز سے کرلو چو گن وائے
دو ملا کے پچگن کرلو بیس کا بھاگ جائے
باقی بچے کے نوگن کرلو دو اس میں اور ملائے
کہت کبیر سنو بھئی سادھو نامِ محمد آئے[۲۲]

---

(۲۰) دھرمیندر ناتھ آزاد، ہمارے رسول، سفارت جمہوری ایران، نئی دہلی ۲۰۱۱ء، ص ۵۹۲۔
(۲۱) ماہنامہ خاتون، رسول نمبر، کراچی، پاکستان، ۱۳۸۳ھ۔

ودیانند پرشاد بھی پیغمبر اسلام ﷺ کے حد درجہ گرویدہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندی الفاظ اور ہندی تلازمات و مناسبات سے بھرپور لطف اٹھاتے ہوئے اس دھرتی پر ان کے آگمن اور وراجمان ہونے کے منظر کی بڑی حسین تصویر کھینچی ہے۔ میلاد النبی ﷺ سے متعلق ہندی میں یہ ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ بطورِ خاص چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

سینت، آمنہ کے من میں جا، کھوج رہی ہے ممتا پیار
ماں بنتے ہی پھوٹ پڑیگی، جس کی سرن سدھامیہ دھار
تبھی ہوا مسکاتا بالک، ملا آمنہ کو نسب سنبل
شبھ پانچ سو اکہتر سن، سوموار دن، ربیع الاول
ایش کرپا کے ہی کارن تو، جنت مانو ملا گود میں
آلنگن کر چوم اٹھایا، کملا نن کھل اٹھا مود میں
شوہر عبداللہ کے مرنے کے نہ رہے کوئی سنتاپ
ہردِے کوش بھر گیا ہرش سے آنندوں سے اپنے آپ
ہر سکھ شانتی پرمود ہرش کا کیندر وندو کیول وہ بالک
اس نے جان لیا ہے من میں، پربھو ہیں اس کے رکھشک پالک[۲۳]

نعوت و مناقب اور اسلامی تعلیمات و شعائر سے مرصع منظوم کلام میں فارسی، عربی اور اردو کے الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ اور ہندی اصطلاحات کا منفرد انداز میں استعمال صرف ہندو سنت اور ہندو کویوں کے یہاں ہی نہیں ملتا بلکہ ایسے مسلم صوفیا اور شعرا کی بھی ایک بڑی تعداد ہے کہ جن کے کلام میں ہندوستان میں رائج و مستعمل مختلف زبانوں کا حسین سنگم نظر آتا ہے۔ مثلاً عبدالعزیز خالد کا حسب ذیل کلام ملاحظہ فرمائیں:

میں شبدوں کی پیاسی، میں چرنوں کی داسی
تری جستجو مجھ کو صبح و مسا ہے

---

(۲۲) دھرمیندر ناتھ آزاد، ہمارے رسول، ص ۵۹۳۔

(۲۳) ماخذ سابق، ص ۵۹۴۔

میں جوگن بروگن، میں کملی کمینی
تو سرتاج میرا، مرا دیوتا ہے
تو دیپک میں کاجل تو درپن میں سیسہ
میں کالک تو پربھات کی لالما ہے(۲۴)
شمار کرنے چلیں، اس کی خوبیوں کا اگر
تو ساتھ چھوڑ دیں تھک کے نیل سنکھ پدم
ہے جوت جس کی فسوں خیر چاندنی کی طرح
شریر جس کا پوتر اور آتما ہے پرم
اسی کو کہتے ہیں مانے جگت جگاون ہار
اسی کے نور سے تت چھن میں دور رات کا تم
مہا پرش جسے آکار الکھ پرکاش کا کہیں
پسینہ جس کا ہے سونا، سگندھ دہ ستم(۲۵)

اسی طرح محمد ممتاز جہاں قدوسی چشتی حنفی گنگوہی (م ۱۹۲۷ء) صاحب سجادہ شیخ عبد القدوس گنگوہی کے یہ نعتیہ اشعار دیکھیں:

توری بنتی کرت ہوں میں سیس نوا دیدار دکھا یا شاہِ عرب
تورے درشن کو ترپت ہے جیا دیدار دکھا یا شاہِ عرب
لگی برہ اگن جلو سگرا بدن ہوا ہند نگریا میں جینا کٹھن
مجھے پیت کے روگ نے مارلیا دیدار دکھا یا شاہِ عرب
اوچاٹ دل ہند سے ہے جیسے مدینہ نینون میں بس رہا ہے
تہارے درشن کو یا محمد یہ جیو ہمرا ترس رہا ہے
کرت ہوں ہت جوڑ بنتی سکھیومدینہ نگری کبھی جو پہونچو
پیا محمد سے اتنا کہیو کہ وہ تو پیتا میں پھنس رہا ہے(۲۶)

---

(۲۴) ماخذ سابق، ص ۱۴۶۔

(۲۵) ماخذ سابق، ص ۱۴۷۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی شاہ واجد پریشان ہیں۔ انھوں نے بھی بزبانِ ہندی بڑے عاجزانہ انداز میں بارگاہِ رسول میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

سدھ لے موری موہے سرتاجا
سدھ کل راجن کے راجا
سدھ لے موری جبریل کے سائیں
ہے بتین کے راج گسائیں
اے صدیق کے راج دلارے
عمر عثماں کے پالن ہارے
سدھ لے بی بی خدیجہ کے بالم
صلی اللہ علیہ و سلم (۲۷)

اسی طرح شاہ محمد علی حسین اشرفی المعروف اشرفی میاں (سجادہ نشین آستانۂ عالیہ اشرفیہ، کچھوچھہ) بہت ہی عظیم روحانی شیخ اور باکمال صوفی گذرے ہیں جو کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ صاحبِ دیوان شاعر بھی ہیں جو تحائفِ اشرفی کے نام سے موسوم ہے اور آپ کے فارسی، اردو، عربی اور ہندی کلام پر مشتمل ہے۔

آپ کے دیوان میں ہندی، ہندوستانی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ اور کلمات کا برمحل استعمال ہوا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے آپ کے مکمل دیوان کا تحقیقی جائزہ لینا کافی دقت طلب اور طوالت کا موجب ہے اس لیے چند منتخب اشعار یہاں ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اسی سے آپ کے دوسرے کلام کے ادبی و لسانی معیار کا بحسن و خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت اشرفی فرماتے ہیں:

درس بنا من کیسے مانے داتا کے گھر جائے
نرگن جان پیا ہیں چتوت جیا مورا جات لجائے
گنونتی درسن مدھ ماتی دھن بوری پچھتائے
سائیں موہنہ نراس جن پھیرو اپنے دوار بلائے

---

(۲۶) محمد ممتاز جہاں قدوسی چشتی حنفی گنگوہی، تحفۂ ممتاز، مطبع بے نظیر، سہارنپور، ب۔ت۔ ص ۱۲۔۱۴
(۲۷) دھرمیندر ناتھ آزاد، ہمارے رسول، ص ۱۴۶۔

راہ تمہارا اشرفی جو ہت تم پر دھیان لگائے
من دھیرج راکھو پیادے ہیں درس دکھائے
صورت لگاؤ پریم ڈگر ما بیٹھو سیس نوائے
آپنی سائیں درس دکھاویں دیکھو من چت لائے[۲۸]

خلاصہ یہ کہ نعوت ومناقب میں ہندوستانی زبانوں کا استعمال بکثرت کیا گیا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے تو انسب ہوگا کہ نعت ومنقبت جیسی روحانی، مذہبی، پاکیزہ اور مبارک صنفوں میں ہندوستانی زبانوں کا استعمال غیر منقسم ہندوستان کی ایک خاص مذہبی، تہذیبی اور ادبی روایت رہی ہے۔ صنفِ نعت سے ہر ایک مکتبۂ فکر کے اہل علم و دانش کا قلبی و روحانی تعلق رہا ہے لیکن منقبت کی صنف سے بطور خاص صوفیاء کرام ومشائخ عظام اور ان کے مریدین ومعتقدین کی وابستگی رہی ہے۔ اس طرح یہ صرف ادبی و لسانی روایت و تجربہ نہیں ہے بلکہ ایک سماجی، روحانی، اور تہذیبی نمونۂ عمل اور مذہبی و انسانی رواداری، اخوت و اتحاد اور ثقافتی ہم آہنگی کی بہترین نشانی ہے، جس کی آج بھی اشد ضرورت ہے۔

فارم IV (رول نمبر ۸)

نام پریس	:	معارف پریس، اعظم گڑھ	نام پبلشر	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی
مقام اشاعت	:	دار المصنّفین اعظم گڑھ	قومیت	:	ہندوستانی
وقفۂ اشاعت	:	ماہانہ	پتہ	:	دار المصنّفین اعظم گڑھ
نام پرنٹر	:	ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی	ایڈیٹر	:	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
قومیت	:	ہندوستانی	قومیت	:	ہندوستانی
پتہ	:	دار المصنّفین اعظم گڑھ	پتہ	:	دار المصنّفین اعظم گڑھ

نام وپتہ مالک رسالہ: دار المصنّفین اعظم گڑھ

میں ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم ویقین میں صحیح ہیں۔

---

(۲۸) محمد علی حسین اشرفی، تحائف اشرفی، بلالی اسٹیم پریس۔ سادھوڑا، انبالہ، ۱۹۱۵ء، ص: ۷۳۔ ۷۴

تحفۃ المجاہدین: ملیبار کی تاریخ کا ایک اہم ماخذ

ڈاکٹر صالح امین ندوی
ریسرچ ایسوسی ایٹ، ڈی ٹی ایل پی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
salehameen2050@gmail.com

برّصغیر ہند کے ساحلی علاقوں کی تاریخ محض سیاسی تغیرات کی داستان نہیں بلکہ تہذیبی، تجارتی اور مذہبی تعاملات کی ایک ہمہ گیر اور جاندار تصویر پیش کرتی ہے۔ جنوبی ہند کا خطہ ملیبار اس اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں اسلام کی آمد عسکری فتوحات کے نتیجہ میں نہیں بلکہ عرب تاجروں کے پرامن روابط اور مسلسل تعلقات کے ذریعے ہوئی، جس نے ایک تدریجی مگر نہایت گہرا سماجی اور مذہبی اثر پیدا کیا۔ یہ خصوصیت ملیبار کی اسلامی تاریخ کو برصغیر کے دیگر علاقوں سے ممتاز بناتی ہے اور اسے ایک منفرد تاریخی مثال کے طور پر پیش کرتی ہے۔

ملیبار کی اس تاریخ کو محفوظ کرنے والے بنیادی مصادر میں "تحفۃ المجاہدین" کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب شیخ زین الدین معبری ملیباری (م:۹۹۱ھ) کی تصنیف ہے، جس میں ایک طرف سولہویں صدی عیسوی کے ان حالات کو نہایت وضاحت کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے جب پرتگیزی طاقت بحر ہند کے تجارتی اور سیاسی نظام میں دخل انداز ہوئی اور اس نے ملیبار کے ساحل پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں اسلام کی ابتدائی آمد، اس کے تدریجی فروغ اور مقامی معاشرے پر اس کے اثرات سے متعلق بھی نہایت اہم اور مفید معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس تصنیف کی اہمیت اس اعتبار سے مزید بڑھ جاتی ہے کہ مصنف خود ان حالات کے عینی شاہد تھے یا ان سے قریبی تعلق رکھتے تھے، جس کے باعث ان کا بیان محض نقل پر مبنی نہیں بلکہ مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر قائم ہے۔

تاہم یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ یہ کتاب ایک خاص تاریخی، فکری اور مذہبی ماحول میں تصنیف کی گئی ہے۔ مصنف کا تعلق ملیبار کے ایک ممتاز علمی و دینی خانوادے سے تھا، جو وہاں کے مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت میں اہم مقام رکھتا تھا۔ اسی پس منظر کے باعث ان کی تحریر

میں اس دور کی مذہبی حساسیت، اصلاحی فکر اور دینی وابستگی کی جھلک فطری طور پر محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر واقعات کا بیان محض تاریخی انداز تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں ایک معنوی اور دعوتی پہلو بھی شامل ہو جاتا ہے، جسے اس کے سیاق و سباق کے ساتھ دیکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔[(۱)]

زیر نظر مقالہ اسی زاویے سے تحفۃ المجاہدین کا تحقیقی مطالعہ پیش کرتا ہے، جس میں کتاب کے تاریخی پس منظر، مصنف کے رجحانات، اور اس کے مندرجات کا دیگر مصادر کے ساتھ تقابلی جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ملیبار میں اسلام کی تاریخ اور پرتگیزی استعمار کے اثرات کو ایک متوازن، سنجیدہ اور مستند تناظر میں سمجھا جا سکے۔

مصنف کا تعارف: شیخ زین الدین معبری ملیباری جنوبی ہند کے اس ممتاز علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے ملیبار میں اسلامی علوم، دعوت اور سماجی قیادت کے میدان میں نمایاں اور دیرپا خدمات انجام دیں۔ آپ کا تعلق 'مخدوم' خاندان سے تھا، جو نہ صرف علمی حیثیت رکھتا تھا بلکہ مذہبی و سماجی رہنمائی کا ایک معتبر مرکز بھی سمجھا جاتا تھا۔ اسی علمی اور دینی ماحول نے آپ کی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا اور آپ کی فکری جہتوں کو متعین کرنے میں اہم اثر ڈالا۔

آپ کا تعلق کالی کٹ کے ساحل کے قریب واقع شہر فنان آباد سے تھا، اور آپ کا شجرہ نسب سادات مشائخ سے جا ملتا ہے۔ نویں صدی ہجری میں، جب دہلی میں سلطان بہلول لودھی (۸۵۵-۸۹۴ھ) اور دکن میں بہمنی حکمران محمد شاہ سوم (۸۶۷-۸۸۷ھ) بر سرِ اقتدار تھے، آپ کے خاندان نے ملیبار کے شہر کوچین میں سکونت اختیار کی۔ بعد ازاں یہ خاندان فنان آباد منتقل ہو گیا، جہاں آپ کے خاندان کے رئیس بزرگ شیخ زین الدین ابو یحییٰ، جو آپ کے دادا تھے، کی سربراہی میں ایک جامع مسجد، خانقاہ اور مدرسہ قائم کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں یہ شہر، ملیبار کے مسلمانوں کے لیے ایک اہم علمی و دینی مرکز بن گیا، اور یہ خاندان 'مخادیم فنانیہ' کے لقب سے معروف ہوا۔ وہاں کے لوگ ان کا انتہائی درجہ احترام کرتے اور ان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے۔

اسی علمی فضا میں شیخ عبد العزیز بن زین الدین بن علی شافعی ملیباری کے گھر میں شیخ

(۱) مثال کے طور پر دیکھئے: شیخ زین الدین بن عبد العزیز المعبری، تحفۃ المجاھدین فی بعض أخبار البرتغالیین، تحقیق: أمین توفیق الطیبی، طرابلس: کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، ۱۹۸۷، صفحہ ۷-۱۰، ۱۶-۱۸، ۴۵-۵۰۔

زین الدین معبری کی پیدائش ہوئی۔ آپ کی تاریخ پیدائش کے متعلق کوئی وضاحت نہیں مل سکی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم دادا شیخ زین الدین ابو یحییٰ کے مدرسہ وخانقاہ میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے حجاز کا سفر کیا، جہاں آپ نے اس دور کے ممتاز علماء سے کسب فیض کیا۔ اسی دوران آپ کو معروف محدث احمد ابن حجر الہیثمی سے شرفِ تلمذ حاصل ہوا۔ اس علمی سفر نے آپ کی بصیرت کو وسعت دی اور آپ کو عالم اسلام کی وسیع فکری روایت سے جوڑ دیا، جس کے نتیجے میں آپ ایک ہمہ جہت عالم کے طور پر سامنے آئے۔[۲]

آپ کا علمی سرمایہ بھی نہایت وقیع ہے اور آپ نے مختلف علوم میں قیمتی تصانیف چھوڑیں، جن میں فقہ، تصوف اور وعظ وارشاد سے متعلق کئی اہم کتابیں شامل ہیں۔ ان میں: (۱) الأجوبة العجيبة عن الأسئلة الغريبة، (۲) أحكام النساء، (۳) تحفة المجاهدين في بعض أخبار البرتغالين، (۴) الجواهر فی عقوبة أهل الكبائر، (۵) إرشاد العباد إلى سبيل الرشاد، (۶) شرح الصدور فی أحوال الموتىٰ والقبور، (۷) المختصر فی ذكر الموت وما بعده، (۸) الفتاوى الهندية، (۹) قرة العين في مهمات الدين اور اس کی شرح (۱۰) فتح المعين شرح قرة العين قابل ذکر ہیں۔ آپ کی وفات ۹۹۱ھ میں ہوئی۔[۳]

تاہم آپ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ محض ایک عالم یا فقیہ ہی نہیں تھے بلکہ اپنے عہد کے حالات سے گہری وابستگی رکھنے والے ایک باخبر اور حساس مؤرخ بھی تھے۔ پرتگیزی استعمار کے دور میں جو سیاسی، معاشی اور مذہبی حالات پیدا ہوئے، وہ آپ کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھے بلکہ ان کا اثر آپ کی تحریروں میں نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'تحفۃ المجاہدین' میں ایک خاص مقصدیت اور معنویت پائی جاتی ہے، جو اسے محض ایک سادہ تاریخی بیان کے بجائے ایک بامقصد اور اثر انگیز تحریر کا درجہ دیتی ہے۔ ان کے بیان میں جہاں عینی مشاہدات کی

---

[۲] عبدالحیّ بن فخر الدین الحسنی، الإعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام (بیروت، لبنان: دار ابن حزم، ۱۹۹۹)، ۴/۳۴۱؛ اشفاق احمد، دراسة تحليلية لكتاب 'تحفة المجاهدين فی بعض أخبار البرتغاليين' دار العلوم دیوبند،
https://darululoom-deoband.com/arabicarticles/archives/1785
(تاریخ الاطلاع: ۸ اپریل ۲۰۲۶)؛ تحفة المجاهدین، تحقیق: الطیبی، صفحہ ۳-۵؛ شیخ زین الدین بن عبد العزیز المعبری، تحفة المجاهدين فی بعض أخبار البرتغاليين، اردو ترجمہ: حکیم سید شمس اللہ قادری (علی گڑھ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بک ڈپو، ۱۹۴۲)، صفحہ ۲-۳۔

[۳] الحسنی، الإعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام، ۴/۳۴۱۔

قوت موجود ہے، وہیں اس دور کی دینی حساسیت اور اصلاحی فکر کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے، جو اسلوبِ بیان کو ایک خاص معنوی رنگ عطا کرتی ہے۔ چنانچہ ان کی شخصیت کو محض ایک مؤرخ کے طور پر دیکھنے کے بجائے ایک ایسے عالم اور رہنما کے طور پر سمجھنا زیادہ مناسب ہے، جو اپنے عہد کے حالات سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور انہیں بہتر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

کتاب کا تعارف: تحفۃ المجاہدین عربی زبان میں لکھی گئی ایک اہم تاریخی تصنیف ہے۔ اس کا مکمل نام "تحفۃ المجاہدین فی بعض أخبار البرتغالیین" ہے۔ اس کے مصنف شیخ زین الدین معبری ملیباری ہیں۔ انہوں نے اسے ایسے دور میں تحریر کیا جب ملیبار پر تگیزی حملوں کے باعث ایک نئے سیاسی اور معاشی مرحلہ سے گزر رہا تھا۔

یہ کتاب صرف واقعات کا خشک بیان نہیں بلکہ اپنے عہد کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس میں ایک طرف تاریخی حالات بیان کیے گئے ہیں اور دوسری طرف اس دور کی فکری، دینی اور سماجی کیفیت بھی جھلکتی ہے۔ مصنف نے ملیبار کے حالات، پرتگیزیوں کی آمد اور اس کے اثرات کو بیان کرتے ہوئے ایسے پہلو بھی شامل کیے ہیں جو اس زمانہ کے اجتماعی شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب محض معلومات فراہم نہیں کرتی بلکہ اپنے زمانے کے ماحول کا بھی نقشہ کھینچتی ہے۔[۴]

کتاب کے اندر موجود شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل دسویں صدی ہجری کے آخری دور، غالباً ۹۹۱ھ کے قریب ہوئی۔ اس قیاس کی بنیاد ان واقعات پر ہے جن کا ذکر مصنف نے کیا ہے اور جو اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کتاب اپنے عہد کے قریب ترین اور معتبر تاریخی بیانات میں شمار کی جاتی ہے۔

کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے:

پہلا باب : جہاد سے متعلق مباحث

دوسرا باب: ملیبار میں اسلام کی آمد

تیسرا باب : مقامی سماجی حالات

---

[۴] تحفۃ المجاہدین، تحقیق: الطیبی، صفحہ ۸۵-۹۰؛ رفیق عبدالبر الوافی الازہری، دراسۃ تحلیلیۃ لکتاب 'تحفۃ المجاہدین فی بعض أخبار البرتغالیین'، مجلۃ ندوۃ التاریخ الإسلامی، ۲۸ (دسمبر ۲۰۱۴)، صفحہ ۲۲۳-۲۲۴، جامعۃ القاہرۃ، کلیۃ دار العلوم، قسم التاریخ الاسلامی والحضارۃ الاسلامیۃ۔

چوتھا باب : پرتگیزیوں کے حالات

یہ ترتیب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کو سوچ سمجھ کر ایک مربوط انداز میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر آخری باب کی تفصیل اس بات کو واضح کرتی ہے کہ پرتگیزی حالات اس تصنیف کا مرکزی موضوع تھے۔ جب اس کتاب کا تقابل دیگر مصادر، خصوصاً تاریخ فرشتہ، سے کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تحفۃ المجاہدین میں ملیبار کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، جبکہ دوسرے مصادر میں یہی مواد اختصار کے ساتھ ملتا ہے۔ اس سے اس کتاب کی بنیادی اہمیت واضح ہوتی ہے۔[۵] یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحفۃ المجاہدین ایک ایسی تصنیف ہے جو اپنے عہد کے حالات کو محفوظ کرتی ہے اور ملیبار کی تاریخ کے مطالعے میں بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تصنیف کا پس منظر: یہ کتاب محض واقعات کی ترتیب نہیں بلکہ ایک خاص دور کی پیچیدہ صورتِ حال کا زندہ اظہار ہے۔ یہ تصنیف ایسے زمانے میں وجود میں آئی جب ملیبار کا خطہ ایک بڑی تبدیلی سے گزر رہا تھا اور وہاں کے سماجی، معاشی اور مذہبی حالات میں نمایاں تغیرات رونما ہو رہے تھے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں پرتگیزیوں کی آمد نے بحرِ ہند کے تجارتی نظام کو ایک نئے رخ پر ڈال دیا۔ اس سے پہلے عرب اور مقامی مسلمان تاجر اس خطے میں نہ صرف تجارت بلکہ سماجی اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ ملیبار کی بندرگاہیں بین الاقوامی تجارت کا اہم مرکز تھیں اور یہاں ایک مستحکم معاشی و سماجی توازن موجود تھا۔ تاہم پرتگیزیوں کی آمد کے بعد یہ توازن بتدریج متأثر ہونے لگا اور طاقت کے زور پر ایک نئی بالادستی قائم کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

---

[۵] مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تصنیف "تاریخ فرشتہ" کے گیارہویں باب میں ملیبار کے حالات بیان کرتے ہوئے تحفۃ المجاھدین سے مأخوذ ایک خلاصہ درج کیا ہے، جو اختصار پر مبنی ہے۔ بعد ازاں اسی خلاصہ کو Anderson نے بعض حواشی کے ساتھ انگریزی میں ترجمہ کر کے تذکرۂ ملیبار کے عنوان سے ۱۸۸۶ میں کلکتہ کے رسالہ Asiatic Miscellany میں شائع کیا۔ تاریخِ فرشتہ کے مختلف فارسی، اردو اور انگریزی ایڈیشنز میں بھی یہ حصہ شامل ہے، جن میں بمبئی، کانپور اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے نسخے قابل ذکر ہیں، جبکہ انگریزی ترجمہ (Briggs) میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں: تاریخ فرشتہ فارسی متن، طبع کانپور، ۱۸۶۴، جلد دوم، صفحہ ۳۶۸ تا ۳۷۳۔ اردو ترجمہ، طبع منشی نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۵، جلد دوم، صفحہ ۴۸۸ تا ۴۹۸۔ Briggs کا انگریزی ترجمہ، طبع لندن، ۱۸۲۹، جلد چہارم، صفحہ ۵۳۱۔

یہ تبدیلی صرف معاشی یا سیاسی حد تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے اثرات سماجی اور مذہبی میدان میں بھی محسوس کیے گئے۔ پرتگیزیوں کی پالیسی کے تحت مقامی آبادی، خصوصاً مسلمانوں، کے اثر و رسوخ کو کمزور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو مختلف قسم کے دباؤ اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن کا ذکر اس دور کے مصادر میں مختلف انداز سے ملتا ہے۔ ان حالات نے ملیبار کے معاشرے میں ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی، جو کسی نہ کسی صورت میں فکری اور عملی ردِّ عمل کا تقاضا کر رہی تھی۔[۶]

ایسے ماحول میں شیخ زین الدین معبری ملیباری سامنے آئے۔ وہ محض ایک عالم نہیں تھے بلکہ اپنے معاشرے کے حالات سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ان کا تعلق ایک ایسے علمی خاندان سے تھا جو ملیبار میں دینی رہنمائی اور سماجی قیادت کا مرکز سمجھا جاتا تھا، اس لیے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان حالات سے بے نیاز رہتے۔ چنانچہ انہوں نے ان بدلتے حالات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ انہیں ایک منظم صورت میں قلم بند کرنے کی ضرورت بھی محسوس کی۔

تحفۃ المجاہدین کی تصنیف دراصل اسی احساس کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں جہاں ایک طرف تاریخی واقعات کا بیان ملتا ہے، وہیں دوسری طرف ایک واضح فکری پس منظر بھی سامنے آتا ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصوں میں جہاد کے احکام اور اس کے فضائل کا ذکر اسی تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے، جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مصنف محض حالات کو بیان نہیں کر رہے بلکہ ایک خاص طرزِ فکر کو بھی سامنے لا رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف ایک علمی ضرورت کے ساتھ ساتھ ایک عملی اور اصلاحی تقاضے کے تحت بھی وجود میں آئی۔

مزید یہ کہ مصنف نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے وسیع تر دنیا، خصوصاً مسلم حکمرانوں کو بھی متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مختلف مواقع پر ہندوستان کے اہل اقتدار، بالخصوص اکبر اور علی عادل شاہ اول جیسے حکمرانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملیبار کے مسلمانوں کے حالات کو اجاگر کیا اور ان کی طرف توجہ دلانے کی سعی کی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ کتاب صرف ایک مقامی تاریخ نہیں بلکہ ایک وسیع تر پیغام ہے، جس کا مقصد حالات کی تصویر پیش

[۶] تحفۃ المجاھدین، تحقیق: الطیبی، صفحہ ۳۵-۴۰، ۴۵-۵۵۔

کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عملی ردِّ عمل کی ترغیب بھی دینا تھا۔(۷)

ان پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحفۃ المجاہدین ایک ایسے عہد کی تصنیف ہے جس میں تاریخ، فکر اور عمل تینوں ایک دوسرے سے گہرے طور پر جڑے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب محض ماضی کے واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک زندہ تاریخی صورتِ حال کی عکاس اور اس پر ایک سنجیدہ ردِّ عمل بھی ہے، اور یہی خصوصیت اسے اپنے عہد کی ایک منفرد اور اہم دستاویز بنا دیتی ہے۔

کتاب کے مشمولات کا جائزہ: تحفۃ المجاہدین کے مندرجات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کو محض واقعاتی ترتیب میں پیش کرنے کے بجائے ایک منظم اور باقاعدہ ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، اور ہر باب اپنے اندر ایک خاص نوعیت کا مواد سموئے ہوئے ہے۔ ان ابواب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایک ایسا فکری اور تاریخی تسلسل سامنے آتا ہے جو قاری کو مرحلہ وار موضوع کے قریب لے جاتا ہے۔

کتاب کا پہلا باب جہاد سے متعلق ہے، جس میں اس کے احکام، فضائل اور اس سے وابستہ دینی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ حصہ ایک فقہی یا مذہبی بحث ہے، لیکن اگر اسے کتاب کے مجموعی سیاق میں دیکھا جائے تو اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یہ باب دراصل ایک فکری بنیاد فراہم کرتا ہے، جس کے ذریعے مصنف قاری کو آئندہ بیان ہونے والے حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتے ہیں۔

دوسرا باب ملیبار میں اسلام کی آمد اور اس کے فروغ سے متعلق ہے۔ اس میں مصنف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اسلام اس خطے میں کس طرح پہنچا اور کس انداز میں یہاں کے لوگوں کے درمیان پھیلا۔ اس سلسلے میں عرب تاجروں کے کردار کا ذکر بھی ملتا ہے، جنھوں نے نہ صرف تجارت کے ذریعے بلکہ اپنے اخلاق اور طرزِ زندگی کے ذریعے بھی اسلام کے تعارف میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ باب اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہ ملیبار میں مسلمانوں کی موجودگی کو ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ پیش کرتا ہے اور بعد کے حالات کو سمجھنے کے لیے ایک مضبوط پس منظر فراہم کرتا ہے۔

تیسرے باب میں مصنف نے ملیبار کے مقامی معاشرے، خصوصاً غیر مسلم باشندوں کے

(۷) ماخذ سابق، صفحہ ۲-۴، ۱۰۔

بعض رسوم و رواج اور سماجی حالات کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ باب نسبتاً مختصر ہے، لیکن اس میں اس دور کے معاشرتی ڈھانچے کی ایک جھلک ملتی ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف طبقات کے درمیان کس نوعیت کے تعلقات موجود تھے۔ اس باب کو شامل کرنے سے کتاب کی تاریخی تصویر مزید مکمل ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذریعے قاری کو صرف سیاسی یا مذہبی حالات ہی نہیں بلکہ علاقے کا سماجی پس منظر بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

چوتھا اور آخری باب سب سے مفصّل اور اہم حصہ ہے۔ اس میں پرتگیزیوں کی آمد، ان کی سرگرمیوں اور ملیبار کے حالات پر ان کے اثرات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس باب کی وسعت اور تفصیل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہی موضوع اس تصنیف کا مرکزی محور تھا۔ مصنف نے مختلف واقعات کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، جن میں بعض ایسے پہلو بھی شامل ہیں جو اس دور کے حالات کو قریب سے سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ واقعات کی کثرت اور ان کی تفصیلی ترتیب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مصنف ان حالات کو خاص اہمیت دیتے تھے اور انہیں محفوظ رکھنے کے لیے سنجیدہ کوشش کر رہے تھے[۸]

اس باب کے مطالعے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے پرتگیزیوں کی آمد کو محض ایک سیاسی تبدیلی کے طور پر نہیں دیکھا بلکہ اسے ایک ہمہ جہت اثر رکھنے والے واقعے کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس آمد کے اثرات معاشی، مذہبی اور سماجی تینوں سطحوں پر محسوس کیے گئے۔ تجارتی میدان میں پرتگیزیوں کی مداخلت کے نتیجے میں مقامی تاجروں، خصوصاً مسلمانوں کی معاشی حیثیت متأثر ہوئی اور سابقہ توازن میں تبدیلی آنے لگی۔[۹]

مذہبی سطح پر بھی پرتگیزیوں کی آمد کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے گئے۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس دور میں مسلمانوں کو اپنے دینی شعائر کی ادائیگی میں مختلف نوعیت کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے مذہبی تشخص پر بھی دباؤ بڑھنے لگا۔ بعض مواقع پر ایسے حالات پیدا ہوئے جن میں مقامی مسلمانوں کو اپنے عقائد اور مذہبی وابستگی کے حوالے سے سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ مصنف کے اشارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرتگیزی اقتدار کے استحکام کے ساتھ بعض سخت

---

[۸] ماخذ سابق، صفحہ ۵۰-۵۵۔

[۹] ماخذ سابق، صفحہ ۳۵-۴۰۔

اقدامات سامنے آئے، جن کے نتیجے میں مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی متأثر ہوئی۔ کہیں ان کی املاک پر دست درازی کی گئی، کہیں ان کے مذہبی مقامات کو نقصان پہنچایا گیا، اور بعض مواقع پر مذہبی شعائر کے احترام میں خلل واقع ہوا۔ اسی طرح ایسے حالات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن میں لوگوں کو اپنے مذہبی طرزِ زندگی پر قائم رہنے میں دشواری پیش آئی۔ (۱۰)

سماجی فضا میں بھی ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب محسوس تھا، جس کی جھلک مصنف کے بیان میں نمایاں ہے۔ مختلف طبقات کے درمیان تعلقات میں تبدیلی اور مجموعی ماحول میں پیدا ہونے والی کشیدگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ یہ تبدیلی صرف اقتدار تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے پورے معاشرتی ڈھانچے کو متأثر کیا۔ (۱۱)

مصنف کے اسلوبِ بیان میں ایک خاص سنجیدگی اور اثرپذیری پائی جاتی ہے۔ ان کے نزدیک یہ محض تاریخی واقعات نہیں بلکہ ایسے حالات تھے جن کے اثرات دیرپا تھے، اسی لیے انہوں نے انہیں تفصیل کے ساتھ محفوظ کیا۔ اس طرح یہ باب نہ صرف واقعات کا بیان فراہم کرتا ہے بلکہ ان کے اثرات کو بھی واضح کرتا ہے، جس کے ذریعہ قاری کو اس دور کی ایک جامع اور زندہ تصویر حاصل ہوتی ہے۔ (۱۲)

ان تمام ابواب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے اپنے مواد کو ایک مربوط اور بامقصد ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ابتداء میں فکری اور دینی بنیاد فراہم کی گئی، پھر تاریخی پس منظر بیان کیا گیا، اس کے بعد سماجی حالات کی جھلک پیش کی گئی، اور آخر میں معاصر واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ یہ ترتیب اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کتاب محض واقعات کا مجموعہ نہیں بلکہ منظم انداز میں مرتب کردہ تصنیف ہے۔

کتاب کی خصوصیات: تحفۃ المجاہدین اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک منفرد تصنیف ہے، جس میں تاریخ، دین اور سماج تینوں پہلو ایک ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہی جامعیت اسے عام تاریخی کتب سے ممتاز کرتی ہے اور اسے ملیبار کی تاریخ کے بنیادی مصادر میں شامل کرتی ہے۔

---

(۱۰) ماخذ سابق، صفحہ ۴۵-۵۰۔

(۱۱) ماخذ سابق، صفحہ ۵۰-۵۵۔

(۱۲) ماخذ سابق، صفحہ ۷-۱۰۔

اس کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنف کے عینی مشاہدات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ شیخ زین الدین معبری ملیباری ان حالات کے قریب تھے جنھیں انہوں نے قلم بند کیا، اس لیے ان کا بیان محض روایتی یا سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں بلکہ وہ ایک زندہ تجربہ کا عکس ہے۔ یہی چیز اس کتاب کو ایک خاص تاریخی اہمیت عطا کرتی ہے اور اسے اپنے عہد کے قریب ترین دستاویزی ریکارڈ میں شامل کرتی ہے۔[۱۳]

ایک دوسری خصوصیت اس کا مقامی نقطہ نظر ہے۔ مصنف نے ملیبار کے حالات کو داخلی زاویہ سے پیش کیا ہے، جس میں مقامی معاشرہ، مسلمانوں کے حالات اور ان کے مسائل کی جھلک نمایاں ہے۔ یہ پہلو اس لیے بھی اہم ہے کہ دیگر مصادر، خصوصاً یورپی تحریریں، انہی واقعات کو ایک مختلف زاویے سے پیش کرتی ہیں۔[۱۴]۔

اس کتاب کا اسلوب بھی قابل توجہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک تاریخی تصنیف ہے، لیکن اس میں محض واقعاتی بیان نہیں بلکہ ایک خاص تاثیر اور معنویت بھی پائی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر اندازِ بیان دعوتی اور اصلاحی۔ یہی اسلوب کتاب کو ایک حد تک اثر انگیز بنا دیتا ہے اور اسے محض خشک تاریخ بننے سے بچاتا ہے۔

تحفۃ المجاہدین کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ نگاری اور دعوتی فکر ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ مصنف ایک طرف واقعات کو قلم بند کرتے ہیں اور دوسری طرف ان سے نتائج اخذ کر کے قاری کو ایک مخصوص سمت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ یہ امتزاج ایک محقق کے اندر یہ تقاضا پیدا کرتا ہے کہ وہ اس کے بیانیہ کو تنقیدی نظر سے دیکھے، تاکہ تاریخ اور دعوت کے عناصر میں فرق کیا جا سکے۔

اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت اس کی ترتیب اور ساخت ہے۔ مصنف نے اپنے موضوع

---

[۱۳] ماخذ سابق، صفحہ ۴۰-۴۵۔

[۱۴]

Danvers, Frederick Charles, *The Portuguese in India,* London: W.H. Allen & Co., 894, pp. 45–60; Pearson, M. N., *A History of the Portuguese in India*. Cambridge: Cambridge University Press, 1987, pp. 30–50.

کو چار ابواب میں تقسیم کر کے نہایت منظم انداز میں پیش کیا ہے۔ ابتداء میں فکری بنیاد فراہم کی گئی، پھر تاریخی پس منظر بیان کیا گیا، اس کے بعد سماجی حالات کی جھلک پیش کی گئی، اور آخر میں معاصر واقعات کو تفصیل سے بیان کیا گیا۔ یہ ترتیب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ کتاب ایک منصوبے کے ساتھ مرتب کی گئی ہے، جس میں مواد کو مرحلہ وار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اسی طرح اس کتاب میں تاریخ اور فکر کا ایک خاص امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ اس میں نہ صرف واقعات درج کیے گئے ہیں بلکہ ان کے پس منظر اور اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، جس سے قاری کو محض معلومات ہی نہیں بلکہ ایک وسیع تر تناظر بھی حاصل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اسے ایک سادہ تاریخی بیان کے بجائے ایک بامعنی اور فکر انگیز تصنیف کا درجہ دیتی ہے۔ (۱۵)

تنقیدی جائزہ: تحفۃ المجاہدین کی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ مسلم ہے، تاہم ہر تاریخی ماخذ کی طرح اس کے مطالعہ میں بھی ایک متوازن اور محتاط نقطۂ نظر اختیار کرنا ضروری ہے، تاکہ اس کے مندرجات کو بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔

سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کتاب کے مصنف شیخ زین الدین معبری ملیباری اپنے عہد کے حالات سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف ایک عالم تھے بلکہ ایک ایسے ماحول میں زندگی گزار رہے تھے جہاں سیاسی، معاشی اور مذہبی سطح پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ اس لیے ان کی تحریر میں ایک غیر وابستہ مؤرخ کا انداز نہیں بلکہ ایک حساس اور باخبر شخصیت کا تاثر محسوس ہوتا ہے، جو اپنے معاشرہ کے حالات کو قریب سے دیکھ رہی ہو۔ (۱۶)

کتاب کے بعض حصوں میں، خصوصاً پرتگیزیوں کے حالات کے بیان میں، واقعات کو کافی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے قاری کو اس دور کے حالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور کئی ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو دیگر مصادر میں مختصر انداز میں ملتے ہیں۔ تاہم مجموعی مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے ان واقعات کو ایک خاص ترتیب اور اہتمام کے

---

(۱۵) الازہری، صفحہ ۲۲۶۔

(۱۶) اشفاق احمد، دراسة تحليلية لكتاب 'تحفة المجاهدين في بعض أخبار البرتغاليين، دار العلوم دیوبند، https://darululoom-deoband.com/arabicarticles/archives/1785 (تاریخ الاطلاع: ۸/ اپریل ۲۰۲۶)۔

ساتھ پیش کیا ہے، جس کے نتیجے میں ان کے بیان میں ایک تاثیر اور معنوی ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کے حالات کے ذکر میں ایک ہمدردانہ اور سنجیدہ انداز نمایاں نظر آتا ہے، جو اس دور کی فضا اور مصنف کی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ پہلو اس کتاب کو ایک خاص اثر انگیزی عطا کرتا ہے۔[۱۷]

جب اس کتاب کا تقابل دیگر تاریخی مصادر، خصوصاً تاریخ فرشتہ اور بعض یورپی آخذ کے ساتھ کیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ واقعات کے بیان میں بعض مقامات پر تفصیل، ترتیب اور زاویۂ نگاہ کے اعتبار سے کچھ تنوع پایا جاتا ہے۔ تحفۃ المجاہدین میں مقامی حالات کی جھلک زیادہ نمایاں ہے، جبکہ یورپی مصادر میں انہی واقعات کو اپنے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے مطابق بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ ڈینورس (Danvers: 1906) کی کتاب *The Portuguese in India* اور ایم این پیئرسن (M. N. Pearson: 2020) کی کتاب *A History of the Portuguese in India* میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان مختلف بیانیوں کو ایک ساتھ سامنے رکھا جائے تو تاریخی حالات کی ایک زیادہ واضح اور ہمہ جہت تصویر سامنے آتی ہے۔[۱۸]

کتاب کے پہلے باب میں جہاد سے متعلق مباحث کا شامل ہونا بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مصنف محض واقعات کو محفوظ کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ ایک فکری اور عملی پہلو بھی اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔

تحفۃ المجاہدین کے اس مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ تصنیف ملیبار کی تاریخ، خصوصاً پرتگیزی دور کے حالات کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت اہم اور بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی اصل قوت اس میں موجود وہ تفصیلات ہیں جو مصنف کے عینی مشاہدات یا ان کے قریب ترین ذرائع پر مبنی ہیں، جس کے باعث اس کا بیان اپنے عہد سے گہری قربت رکھتا ہے۔

---

(۱۷) تحفۃ المجاہدین، تحقیق: الطیبی، صفحہ ۵۰-۶۰۔

(۱۸) محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، منشی نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۵، ص: ۴۸۸-۴۹۸؛

Danvers, Frederick Charles. *The Portuguese in India*. London: W.H. Allen & Co., 1894, pp. 45–60; Pearson, M.N., *A History of the Portuguese in India*. Cambridge: Cambridge University Press, 1987, pp. 30–50.

اس تصنیف کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا مقامی اور اندرونی نقطۂ نظر ہے، جس کے ذریعے ملیبار کے مسلمانوں کے حالات، ان کے مسائل اور ان کے تجربات کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی پہلو اسے دیگر مصادر سے ممتاز بناتا ہے اور تاریخ کے مطالعے میں ایک اہم توازن فراہم کرتا ہے۔

اگر تحفۃ المجاہدین کو دیگر تاریخی مصادر کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو یہ نہ صرف ملیبار کی تاریخ کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ برصغیر میں اسلامی تاریخ کے ایک اہم باب کو بھی واضح اور ہمہ جہت انداز میں سامنے لاتی ہے۔ یہ کتاب اپنے عہد کی ایک مؤثر اور قابل قدر تاریخی دستاویز ہے، جو آج بھی تحقیق کے میدان میں اپنی اہمیت برقرار رکھے ہوئے ہے، اور جس سے استفادہ کرتے ہوئے تاریخ کے اُس اہم دور کو زیادہ گہرائی اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔

دارالمصنّفین کا لائف ممبر بنئے

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ملت اسلامیہ کا ایک بے نظیر علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ اس نے سیرت نبویؐ اور مختلف علوم وفنون پر بیش بہا لٹریچر فراہم کیا ہے۔ پچھلی ایک صدی کے دوران دارالمصنفین نے اب تک پونے تین سو کے قریب تصنیفات و تالیفات ملک کے سنجیدہ علمی حلقوں میں پیش کی ہیں۔ ادارے کا ماہنامہ ترجمان علمی "معارف" ملک وملت کی ذہنی وفکری بیداری میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ دارالمصنفین کی بقا اور ترقی ملت اسلامیہ کے مصالح علیا میں شامل ہے۔ دارالمصنفین کے مشن سے جڑنے کا ایک طریقہ لائف ممبری قبول کرنا ہے۔ لائف ممبر شپ کی فیس پچاس ہزار روپے ہے۔ ہر لائف ممبر کو سیرۃ النبیؐ کی سات جلدوں کا سٹ پیش کیا جاتا ہے نیز رسالہ "معارف" بھی تاحیات جاری کیا جائے گا۔ دارالمصنفین کے حیاتی رکن بن کر اس تہذیبی مشن میں شامل ہوں۔

Darul Musannefin Shibli Academy

Shibli Road, Azamgarh 276001, U.P.

Contact: +91-81279-45267 (office). **Email:** info@shibliacademy.org
A/C Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH.
A/C No: 0504010100032752. **Bank Name:** PUNJAB NATIONAL BANK.
Branch: HEERPATTI - AZMAGARH (U.P.). **IFSC:** PUNB 0476100.
Bank Code: 476100

باب التقریظ والانتقاد

قرآنی استعارے

کلیم صفات اصلاحی
kaleemsefatislahi@gmail.com

پروفیسر مظفر علی شہ میری ،**قرآنی استعاروں کی فنی عظمت** ،صفحات ۵۹۶: قاضی اسد ثنائی، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۲۶ء، قیمت: ۷۵۰روپے۔ موبائل: ۹۹۴۹۴۲۲۷۸۶، ای۔ میل:shshmirihcu@gmail.com

"استعارہ" عربی لفظ ہے۔اس کا معنی کوئی چیز ادھار یا عاریتاً لینا ہے۔ جب کسی لفظ کو اس کے اصل معنی کی جگہ دوسرے معنی کے لیے بطور علامت یا تشبیہ کے استعمال کیا جائے تو اسے **استعارہ** کہتے ہیں۔ استعارہ انسانی گفتگو کی جان اور مکالمے کی شان ہے۔ انسان روزمرہ زندگی کی آپسی گفتگو میں طرح طرح کے استعارے استعمال کر کے اپنا مافی الضمیر ادا کرتا ہے۔ قرآن مجید کلام الٰہی ہے جس کا مخاطب انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام اپنے بندوں کو سمجھانے کے لیے قرآن میں جو جامع اور بلیغ اسلوب اپنایا ہے ان میں استعارہ بھی شامل ہے۔ قرآنی استعارات کے بغور مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس نے استعاروں کا استعمال وہیں کیا ہے جہاں کسی بات کے کہنے میں عار و جھجھک حارج ہو یا پھر جہاں معانی میں تہ داری و گہرائی مقصود ہو۔ قرآنی استعارات پر اردو میں کم توجہ دی گئی ہے۔ آج بھی اس اہم موضوع کو جو خاطر خواہ التفات مطلوب ہے وہ قرآنی محققین کی جانب سے اسے نہیں ملا ہے۔ اس کی وجہ غالباً اس موضوع کا خالص ادبی ہونا بھی ہو سکتا ہے، حالانکہ قرآنی استعاروں کی صحیح سمجھ قرآن فہمی کی راہ کو مزید آسان بنا سکتی ہے۔

"معارف" نے اس موضوع پر حافظ منیر احمد خاں کا ایک مفصل پہلا مقالہ "قرآنی محاورات واستعارات" کے نام سے چار قسطوں (اپریل تا جولائی ۱۹۹۹ء) میں جب شائع کیا تو اس مضمون پر زیر نظر کتاب کے مصنّف پروفیسر شہ میری نے اس وقت کے مدیر معارف مولانا ضیاء الدین اصلاحی کو ۳۰/ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو خط لکھا جس میں انہوں نے اس کے بعض مندرجات سے اختلاف کیا اور

ساتھ ہی ''قرآنی استعارے اوران کے ترجمے'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ بھی بھیج دیا۔ مذکورہ خط اور مقالہ مضامین معارف کی فائل میں دب گیا۔ جب ملا تو مولانا نے اس کی اہمیت کے پیش نظر نومبر ۲۰۰۰ء کے معارف میں معذرت کے ساتھ شائع کیا۔

ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی مرحوم کی کتاب ''قرآنی تشبیہات واستعارات'' مولاناعطاء الرحمٰن قاسمی کی ترتیب سے ۲۰۰۶ء میں اس مضمون کے بعد منظر عام پر آئی۔ لیکن منیر احمد خان کے مقالے اور خالدی مرحوم کی کتاب میں خاص قرآنی استعارات کو موضوع بنانے کے بجائے اس میں محاورات اور تشبیہات کو شامل کرکے مشترکہ طور پر بحث کی گئی تھی۔

زیر نظر کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں تشبیہات و محاورات سے قطع نظر صرف قرآنی استعارات کی فنی عظمت کو ایک ایسے اہل قلم نے اجاگر کیا ہے جو عصری درس گاہ کے طالب علم رہے ہیں اور قرآن کی اس اہم ادبی و تحقیقی خدمت کو انھوں نے گویا ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور فائز المرام ہوئے۔

مصنّف سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد کے صدر شعبۂ اردو اور ڈاکٹر عبدالحق اردو یونیورسٹی، کرنول کے بانی وائس چانسلر رہے ہیں۔ ان کی شناخت دنیائے علم و تحقیق کی معتبر شخصیت کی حیثیت سے ہے۔ اردو زبان وادب میں گراں قدر خدمات کی وجہ سے ملک کے مختلف سرکاری وغیر سرکاری اداروں نے انہیں اعزازات سے بھی نوازا ہے۔ اردادب ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ ''اردو غزل میں استعاراتی نظام'' نامی ان کی کتاب کو اپنے موضوع پر منفرد ہونے کے سبب خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔

استعارات سے دلچسپی ہی غالباً انہیں قرآنی استعارات تک لے گئی۔ ان کے بقول ایک دن انھوں نے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن میں استعارے کی مثال دیکھی۔ اس وقت انہیں علم البیان اور استعارے پر گرفت حاصل ہوچکی تھی۔ سوچا کیوں نہ قرآن شریف کے استعاروں پر تحقیق کی جائے۔ اس طرح ہمت مرداں، مدد خدا کے سہارے اپنی سابقہ علمی زندگی کے برعکس بالکل نئے سفر کے لیے روانہ ہوگئے اور بحر قرآنی میں غواصی کرکے ایسے ایسے گوہر آب دار نکال لائے جو ان ہی کا حصہ ہیں۔

انہوں نے قرآنی استعاروں کا مطالعہ اپنی مذکورہ کتاب ''اردو غزل میں استعاراتی نظام'' میں پیش کردہ اردو استعارے کے اصول کے مطابق کیا ہے۔ مقدمہ میں استعارہ کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں۔ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی استعاروں میں فرق کی نشاندہی کی ہے۔ استعارے کی قسموں کے متعلق ان کا یہ احساس ہے کہ قدماء نے تقدیم و تاخیر اور فرق و امتیاز کے معاملے میں صرف اپنی رائے پر اعتماد کیا ہے اسی لیے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کے مطابق بلاغت کی کتابوں میں استعارے کی کل ۲۳ قسموں کا ذکر ہے جن میں آٹھ قسموں کی تعریف تو موجود ہے لیکن ان کے نام نہیں تھے۔ مصنّف نے اپنی مہارت فن سے ان کے درج ذیل نام تجویز کئے ہیں: استعارہ داخلی، استعارہ خارجی، استعارہ حسیّہ، استعارہ عقلیہ، استعارہ حسی طرفین، استعارہ حسی مجردہ، استعارہ حسی مرشحہ اور استعارہ حسی مرکبہ۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ استعاروں کے یہ نئے نام ان کی کتاب کے علاوہ عربی، فارسی یا اردو کی تصانیف میں کہیں نہیں ملیں گے۔ لیکن حقیقت ہے کہ امام ابو عبداللہ جمال الدین محمد بن سلیمان معروف بہ ابن نقیب کی کتاب مقدمہ تفسیر ابن النقیب میں حروف کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ الاستعارۃ المحسوس للمحسوس اور الاستعارۃ المحسوس للمعقول اور الاستعارۃ المعقول للمحسوس جیسے نام ملتے ہیں جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ استعارہ حسیہ اور استعارہ عقلیہ کے نام عرب قدماء کی کتابوں میں پہلے سے موجود ہیں۔ مصنّف نے اس کتاب میں استعارے کی ۲۳ قسموں میں سے صرف ۱۳ مثالیں قرآن مجید سے پیش کیں اور ان پر دقیق اور فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ باقی دس قسموں کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ ان میں سے اکثر کی کوئی امتیازی وانفرادی اہمیت نہیں تھی، اسی لیے ان سے قطع نظر کیا گیا ہے۔ انہوں نے زیر نظر کتاب کے سلسلے میں لکھا ہے کہ قارئین کو اس کا مطالعہ محض قرآنی استعارات کی فنی وادبی عظمت کو سمجھنے کے مقصد سے کرنا چاہیے۔ عقائدی و مسلکی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا کتاب کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

مصنّف کے مطابق ''استعارہ'' کسی لفظ کا وہ تخلیقی استعمال ہے جس میں لفظ اپنے حقیقی (لغوی) معنی ترک کرکے ایسا مجازی (غیر حقیقی) معنی قبول کرتا ہے جو اس میں موجود نہ تھا۔ ان کے نزدیک استعارہ ایک فن ہے اور قرآن میں اس فن بلیغ کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی کی کتاب ''قرآنی تشبیہات واستعارات'' میں پورے قرآن پاک کا بالترتیب احاطہ کرتے ہوئے ۶۷ سورتوں میں واقع تشبیہات واستعارات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا تھا۔ لیکن زیر نظر کتاب میں الگ الگ سورتوں کے بجائے پورے قرآن سے الفاظ وآیات کا انتخاب کیا گیا ہے اور استعارے کی ہر قسم کے تحت متعدد الفاظ وآیات بہ طور مثال پیش کی گئی ہیں۔ استعارے کی کل ۱۳ اقسام یعنی استعارہ بالتصریح کے تحت بیع، حبل اللہ، وجہہ مسودا جیسے ۱۸ قرآنی الفاظ وآیات؛ استعارہ بالکنایہ کے تحت ۸، استعارہ وفاقیہ کے تحت ۵، استعارہ عنادیہ کے تحت ۴، استعارہ مرشحہ کے تحت ۵، استعارہ غریبہ کے تحت ۳، استعارہ حسیہ کے تحت ۷، استعارہ عقلیہ کے تحت ۴، استعارہ حسی طرفین کے تحت ۲، استعارہ حسی مجردہ کے تحت ایک لفظ نوراً مبیناً، استعارہ حسی مرشحہ کے تحت ۲۶، استعارہ تمثیلیہ کے تحت ۲۷ اور استعارہ تبعیہ کے تحت سب سے زیادہ ۴۶ قرآنی الفاظ وآیات میں استعاراتی مفاہیم کا استقصاء اوران کے استعاراتی معانی کی توضیح وتشریح کی گئی ہے اور طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ آیت میں موجود استعاراتی لفظ کے لغوی پھر استعاراتی معنی مع ترجمہ وتشریح وماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد موجود استعارے کی نوعیت بتائی ہے۔ اسی کے ساتھ تفہیم استعارہ کے عنوان سے استعاراتی معانی حوالوں کے ساتھ سمجھائے گئے ہیں اور ساتھ ہی مختلف مفسرین کے آراء کا تقابلی مطالعہ اس مقصد سے پیش کیا ہے کہ استعاروں کی تفہیم کے سلسلے میں کس نے کیا تجزیہ کیا ہے؟ ان تمام قسموں کی پہلے مختصر لفظوں میں اور اگلے صفحے میں مفصل تعریف بھی کر دی ہے۔ ساتھ ہی بعض اقسام کے ذیل میں مستعار لہ، مستعار منہ، وجہ جامع اور نوعیت استعارہ پر مشتمل نقشہ بھی دیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد اگلی بحث کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ استعارہ بالتصریح کی تعریف میں لکھا ہے جس میں مستعار لہ محذوف اور مستعار منہ مذکور ہوتا ہے۔ استعارہ بالکنایہ میں مستعار منہ کی کوئی خصوصیت مذکور ہوتی ہے مگر خود مستعار منہ کا ذکر نہیں ہوتا۔ استعارہ حسی طرفین کی تعریف میں لکھا ہے کہ جس کے مستعار لہ اور مستعار منہ دونوں حسی اور ان کی وجہ جامع عقلی ہو۔ اسی طرح استعارہ تبعیہ، جس کی مثالیں قرآنی استعارات میں ان کو سب سے زیادہ ملی ہیں، کی تعریف یہ کی ہے کہ فعل، شبہ فعل یا حرف سے استعارہ بنانے کو استعارہ تبعیہ کہتے ہیں۔ اس کے تحت سب سے پہلے سورۂ بقرہ میں وارد لفظ کسب کے لغوی

معنی کے بارے میں لکھا ہے کہ "الکسب" جلب نفع یا خوش نصیبی حاصل کرنے کے لیے کسی چیز کا قصد کرنے کو کہتے ہیں جیسے کسب مال وغیرہ۔ کسب کا استعاراتی معنی نیک یا برے اعمال کرنے کے آتے ہیں۔ مزید لکھتے ہیں کہ یہ استعارہ تبعیہ ہے کیوں کہ اس میں عمل (مستعار لہ) کرنے کو "کمائی" کرنا (مستعار منہ) کہا گیا ہے۔ اعمال اور کمائی میں موجود صفت حصول اس کی وجہ جامع ہے۔ اسی طرح "یزکیھم" کے بارے میں ہے کہ یہ استعارہ تبعیہ ہے کیونکہ اس میں گناہوں سے اجتناب کرنے (مستعار لہ) کو پاک کرنے (مستعار منہ) سے استعارہ کیا گیا ہے۔ پاکیزگی اور صفائی اس کی وجہ جامع ہے۔

استعارہ و کنایہ کے لغوی فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کنایہ میں لفظ کے مجازی معنی کے ساتھ حقیقی معنی بھی مراد لینے کی گنجائش رہتی ہے۔ جو اس باریک فرق کو ملحوظ نہیں رکھ پاتے وہ کنایے کو استعارہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ قرآنی استعاروں کی شناخت کے دوران انہیں ایسے متعدد مواقع ملے جن میں بعض اردو مفسرین یا مترجمین نے قرآنی الفاظ کے کنایہ کے بجائے استعاراتی معنی لکھے ہیں۔ ان مواقع پر مصنّف کو تامل کرنا پڑا ہے کہ وہ ان قرآنی الفاظ کو حقیقی معنی کے طور پر لیں یا مجازی معنی کے طور پر۔ مثلاً سورہ القیامہ کی آیات نمبر ۲۹ اور ۳۰ میں کہا گیا ہے کہ حشر کے روز پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی اور بندے کو اپنے رب کی طرف چلنا پڑے گا۔ آیت کے اگلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسے اپنے رب کی طرف چلنا ہے۔ مگر وہ چلے گا کیسے؟ جب کہ اس کی پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہوئی ہو۔ چنانچہ یہ مشکلوں کا استعارہ بھی ہو سکتا ہے اور حقیقت حال بھی۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ روز حشر گنہگاروں کی پنڈلی سے پنڈلی ملا دے تا کہ وہ چل کر اپنے رب کی طرف نہ جا سکیں۔ کافی غور و فکر کے بعد انہوں نے ان مثالوں کو کنایہ ہی کی مثالوں کے تحت رکھا۔ دونوں کے درمیان باریک فرق واضح کرتے ہوئے اس کی مزید متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔ سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۶ میں "لمستم النساء" کا عام طور سے استعاراتی معنی عورتوں کو ہاتھ لگانا بتایا گیا ہے۔ مصنّف کا کہنا ہے کہ اس آیت میں عورتوں کو ہاتھ لگانا استعارے سے زیادہ کنایہ لگتا ہے۔ یہی استعارہ سورہ مریم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ بی بی مریم کا یہ کہنا کہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں کنایہ ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں آیتوں میں اس کے حقیقی اور مجازی دونوں معنی مراد لینے کی گنجائش ہے۔

والبیت المعمور (آباد گھر کی قسم)، کو مولانا امین احسن اصلاحی نے استعارہ قرار دیا ہے۔ مصنّف کے خیال میں یہ کنایہ ہے کیوں کہ اس کے معنی کعبۃ اللہ کے لیے جائیں یا آباد زمین کے دونوں صورتوں میں اس کے حقیقی معنی کے ساتھ مجازی معنی مراد لیے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح والسقف المرفوع (اونچی اٹھائی ہوئی چھت کی قسم) بھی مصنّف کے نزدیک کنایہ ہے یعنی اس میں حقیقی ومجازی دونوں معنی کی گنجائش ہے اور والصبح اذا تنفس کو کئی علماء نے استعارہ کہا ہے۔ مصنّف کہتے ہیں کہ یہ تجسیم کی مثال ہے کیوں کہ اس میں صبح کو انسانی صفت سانس لینے سے متصف کیا گیا ہے۔

قرآنی استعاروں کے متعلق ان کا یہ خیال ان کے وسعت مطالعہ وتحقیق پر دال ہے کہ قرآن کے تقریباً تمام استعارات آفاقی ہیں اوران کو سمجھنے کے لیے کسی خارجی عنصر یعنی کسی ملک، تہذیب یا جگہ کی تاریخ وغیرہ سے واقف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کچھ اس انداز اور اسلوب میں تخلیق ہوئے ہیں کہ زمان ومکان اور تمدن ومعاشرے کی قید سے یکسر بری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اکثر قرآنی استعارات ہماری روزمرہ گفتگو کا حصہ، انسانی تجربات ومشاہدات، انسانی حرکات وسکنات، انسانی جذبات واحساسات، انسانی نفسیات کی رنگارنگ کیفیات اور بے پایاں حکمتوں سے ماخوذ ہیں، اس لیے بہ آسانی سمجھے جاسکتے ہیں اوران کی یہی خوبی ان کو زمان ومکان کی قید سے آزاد اورانہیں آفاقیت عطا کرتی ہے۔

کسی استعارے پر محاورے کا گمان گذرنا فطری معاملہ ہے۔ مصنّف نے کافی غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محاورے کے معنی اکہرے ہوتے ہیں اوراستعارہ ایک سے زیادہ معانی کے امکانات روشن کرتا ہے۔ مثلاً سینے پر سانپ لوٹنے یعنی ”دوسروں کی ترقی دیکھ کر جلنے“ یا ”دل دینا، محبت کرنے“ کے ایک ہی معنی نکلتے ہیں۔ اس میں دوسرے معنی کی گنجائش نہیں ہے۔ مصنّف کی اس نشاندہی سے قاری استعارے اور محاورے کو بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔ مصنّف نے کتاب میں اس کی کئی ایک مثالیں دے کر اس کو اور زیادہ واضح کردیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اردو کے بعض مفسرین نے قرآنی استعاروں کی شناخت اور نشاندہی کی ہے لیکن یہاں مثال اردو کے بجائے امام راغب کی مفردات القرآن سے پیش کی ہے (ص ۴۲)۔

استعارہ کے فن پر مصنّف کو ماہرانہ دست رس حاصل ہے۔ اسی لیے کتاب میں ایسے متعدد مقامات نظر آئے جہاں انہوں نے متعدد مفسرین کا تعاقب کیا ہے اور فنی لحاظ سے ان کے پیش کردہ استعاراتی مفہوم کی کمیوں کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے بعض مفسرین کا باہم تقابلی مطالعہ کر کے بتایا ہے کہ فلاں مفسر نے ہاتھ باندھنے کو بخل کا استعارہ اور دوسرے نے اس کو کنایہ قرار دیا ہے (ص ۴۲)۔ مصنّف کو اپنے نتائج تحقیق پر اصرار نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے استعارے کو سمجھنے میں اپنی غلطی، ہر قرآنی استعارے تک اپنی عدم رسائی یا استعاروں کی تقسیم میں کمی بیشی کے امکان اور اپنے عجز کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔

کسی موضوع پر فنی گفتگو عام قاری کی دلچسپی کی چیز نہیں ہوتی۔ مصنّف کو قاری کی اس نفسیات کا اندازہ بخوبی تھا۔ اسی لیے انہوں نے دانستہ طور پر قرآنی استعارات کی تحقیق و تجزیے کی زبان اس قدر سادہ، آسان اور اسلوب بیان اتنا دلچسپ اختیار کیا ہے کہ ہر صاحب ذوق اس کو ضرور پڑھنے کی کوشش کرے گا۔

مصنّف نے قرآنی استعارات کا یہ مرصع تاج محل زیادہ تر اہم عربی مصادر کتب تفسیر ابن کثیر، الاتقان فی علوم القرآن، مفردات القرآن، البلاغۃ الواضحۃ، احسن البیان اور التبیان فی علوم القرآن وغیرہ کے اردو ترجموں اور مشہور اردو تفاسیر تدبر قرآن، تفہیم القرآن، ترجمان القرآن، تفسیر ماجدی، تذکیر القرآن وغیرہ کی مدد سے تیار کیا ہے لیکن خاص بات یہ ہے کہ استفادہ کرتے وقت آنکھ کھلی رکھی ہے اور حسب موقع وضرورت ان مفسرین کے بیان کردہ استعاراتی معانی سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے فکری ملاحظات پیش کیے ہیں۔ استعاروں کے متعلق یہ کتاب اس قدر متنوع معلومات سے لبریز ہے کہ قرآنی استعاروں کی شناخت میں قاری کو کوئی مشکل نہ ہوگی۔ البتہ کتاب میں حوالے قدیم کے بجائے جدید طرز کے مطابق ہونے چاہئے تھے۔ اس سے کتاب کی استنادی حیثیت میں اضافہ ہوتا۔ قرآنی استعاروں کی فنی عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھانے میں کامیاب یہ وقیع تصنیف لائق مطالعہ، اردو کے ذخیرۂ قرآنیات میں گراں قدر اضافہ اور مصنّف کے لیے یقیناً توشۂ آخرت ہے۔

تبصرۂ کتب

انیس احمد، تحقیق عمر عائشہؓ (بوقت نکاح ور خصتی): متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات:۱۶۸، قیمت:۱۵۰روپے، سالِ اشاعت:۲۰۲۴ء، پتہ: مہتاب بک ڈپو، ایک منارہ مسجد، تکیہ، اعظم گڑھ،

انیس اعظمی، مترجم ڈاکٹر سرفراز نواز، دی ایج آف حضرت عائشہؓ، صفحات:۱۶۵، قیمت: ۲۰۰روپے، سال اشاعت:۲۰۲۵ء، پتہ: النور پبلی کیشنز، دہلی

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سیرت دراصل سیرت النبیؐ ہی کا ایک حصہ ہے۔ یعنی وہ نبی اکرم ﷺ کی عائلی زندگی کی ترجمان ہے۔ اس لیے، قرآن وحدیث و تاریخ یعنی اسلام کے تعلق سے نہایت اہمیت کے حامل اور بنیادی مصادر، حضرت عائشہؓ کے ذکر سے معمور ہیں اور یہ گویا امت کے نصف حصہ یعنی خواتین کے لیے خاص طور پر رہنمائی اور پیروی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو زبان میں باضابطہ سیرت عائشہؓ کو مرتب کرنے کا خیال قریب سوا سو سال پہلے، مولانا سید سلیمان ندوی کو اس وقت آیا جب وہ تعلیمی مراحل سے گزر رہے تھے لیکن علامہ شبلی نعمانی کے فیض تربیت سے تصنیفی لیاقت سے آراستہ ہو کر وقت کے تقاضوں سے آشنا ہو چکے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو کی نشاۃ ثانیہ میں رجال اسلام کے کارنامے تو ایک حد تک منظر عام پر آچکے ہیں اور آرہے ہیں لیکن خواتین اسلام کے کارہائے نمایاں اب تک پردہ خفا میں ہیں۔ اس ضرورت کو انھوں نے "نساء الاسلام" کا نام دیا اور اس کی پہلی کوشش کا اظہار سیرت عائشہؓ کی شکل میں کیا۔ سیر وسوانح کے لئے عام طور سے تاریخ کی کتابیں ہی مراجع کی صورت میں سب سے پہلے سامنے آتی ہیں۔ لیکن علامہ شبلی نعمانی نے نبی کریمؐ کی سیرت طیبہ کے لیے قرآن وحدیث کو اصل مصدر و مرجع بنانے کا جو اہتمام کیا، سید صاحب نے اسی طرز کی تقلید میں سیرت عائشہؓ کے لیے معلومات کا ماخذ، احادیث کی کتابوں کو بنایا اور عام تاریخ کی کتابوں کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بعض واقعات جن کا دور حدیث سے تعلق نہیں تھا، اس کے لئے البتہ بدرجۂ مجبوری تاریخ کی کتابوں سے رجوع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت عائشہؓ جو گرچہ ایک نوخیز قلم اور دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ تھی غیر معمولی مقبولیت کی مثال بن گئی۔ ایک صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس کی اشاعت و مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ عام افادیت کے ساتھ اصحاب غور و فکر نے سیرت عائشہؓ

کے تحقیقی مطالعہ کے لیے بھی وقت نکالا۔ تحقیق کے ساتھ تنقید کا رویہ لازم وملزوم کا ہے۔ حضرت عائشہؓ کے حالات میں نکاح اور رخصتی کے وقت ان کی عمر کا تعین بہر حال سوال پیدا کرنے کی وجہ بنتا رہا۔ لیکن ایک استثنائی واقعہ سمجھ کر عام طور سے اس مقام سے کتاب کا قاری گزرتا رہا اور اس سے بھی زیادہ صحیح بخاری میں موجود روایتوں پر اعتبار واعتماد بلکہ عقیدہ کی سی پختگی بھی اسے قبول کرنے میں مانع نہیں ہوئی۔ لیکن مستشرقین اور معاندین کے ایک طبقے نے اس استثنائی واقعہ کو گویا اسلام کی معاشرتی اخلاقیات کے لیے طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا۔ جس کا جواب علماء کے قلم سے آتا بھی رہا لیکن خلش بہر حال ان کے دلوں میں رہی جو مخالفین و معاندین کے لیے مسکت و مدلل جواب کے مخلص خواہش مند تھے۔ چند سال پہلے اسی خواہش مند طبقہ کی نمائندگی کرتے ہوئے جناب انیس احمد نے تحقیق عمر عائشہؓ اور حقائق عمر عائشہؓ کے نام سے دو کتابیں شایع کیں جس پر تبصرہ کرتے ہوئے معارف نے لکھا تھا کہ یہ دونوں کتابیں، روایات بخاری کی مفصل تشریح، توضیح، توجیہ اور تردید میں ہیں اور نتیجہ بحث یہ ہے کہ نکاح کے وقت ام المومنین کی عمر پچیس چھبیس سال سے کم نہیں تھی۔ اس وقت یہ بھی لکھا گیا تھا کہ مصنف نے جس طرح اپنی بات کو باوزن، معقول اور لائق قبول بنایا ہے، اس کی محنت اور نیت دونوں دل سے داد کے لائق ہے۔ اب کتاب کا نیا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے اور اس میں کچھ تحریروں کا اضافہ بھی ہے لیکن اصل مضمون اور دلائل وہی ہیں جو پہلی اشاعت میں تھے۔ مصنف کی تمام توجہات اور تحقیقات کی تہہ میں ان کا یہ خیال بلکہ عقیدہ ہے کہ ان روایتوں کو روافض نے وضع کیا اور بے شمار موضوع احادیث کی طرح ان کو بھی بڑی چابک دستی سے محفوظ ترین مجموعہ احادیث میں شامل کر دیا۔ مصنف کا دعویٰ ہے اور صحیح بھی ہے کہ انہوں نے کوئی نئی بات نہیں لکھی بلکہ مقتدر علمائے کرام کی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ بوقت نکاح، حضرت عائشہؓ بچی نہیں تھیں۔ جبیر بن مطعم سے نسبت اور پھر اس کا توڑا جانا، حضرت اسماءؓ کی عمر، حضرت ابو بکرؓ کے ارادۂ ہجرت حبشہ کی روایت، غزوۂ بدر مین حضرت عائشہؓ کی موجودگی اور واقعۂ افک وغیرہ سے مصنف نے استشہاد میں دقت نظر سے کام لیا۔ ان کے عقلی دلائل بھی ایسے ہیں کہ جن کی معقولیت پر شک کرنا مشکل ہے۔ ایک سنجیدہ قاری کی اہمیت بھی اس کے مطالعہ سے ہوتی ہے مگر حرف شکایت کے بھی انہوں نے کئی موقع فراہم کر دیے ہیں اور وہ ہے کہیں کہیں ان کا نہایت تیز و تند لہجہ۔ ایک روایت کے تعلق سے تمام سیرت نگاروں اور علماء

کی جماعت کو ہدف طنز بنانا اور پروفیسر یاسین مظہر صدیقی کی بعض عبارتوں کو بہ تکرار، بطور استہزاء نقل کرنا، کتاب کے سنجیدہ مطالعہ کو زیب نہیں دیتا۔ گو یہ بھی سچائی ہے کہ لہجے کی یہ تلخی بصرہ میں روایتوں کے گڑھنے والے کارخانوں کی وجہ سے ہے اور اس میں رسول اکرمؐ اور ام المومنین کی محبت اور عقیدت کا نہایت قابل قدر جذبہ ہی محرک حقیقی ہے۔

انیس صاحب کا یہ اخلاص تھا جس نے کتاب کو مقبولیت دی اور اس کے انگریزی ترجمے کی راہ ہموار کی، ترجمہ ڈاکٹر سرفراز نواز کے قلم سے ہے جو انگریزی ادب کے استاد ہیں لیکن اردو نثر و نظم کے بھی اداشناس ہیں۔ انہوں نے سلیس ترجمہ کرکے انگریزی داں طبقہ کے لیے ایک عمدہ تحفہ پیش کردیا۔ (محمد عمیر الصدیق ندوی)

جناب شمیم طارق، عارفانہ اور متصوفانہ اشعار، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۴۴، قیمت ۲۵۰/ر روپے، سن اشاعت ۲۰۲۵ء، پتہ: ایم آر پبلی کیشنز، ۱۰۔ میٹرو پول مارکیٹ، ۲۵۔۲۷۴۲، کوچہ چیلان، دریاگنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲، ایمیل:
abdus26@hotmail.com

کتاب کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ چند منتخب اشعار کا مجموعہ اور ماضی میں اس قسم کی روایتوں کا جدید اور تازہ حصہ ہے۔ مگر خوش گوار حیرت تب ہوئی جب اس میں قدیم و جدید مشاہیر شعراء کی کسی منتخب غزل کا تعارف، تبصرہ، تشریح اور تفسیر صرف اس بنیاد پر نظر آئی کہ اس غزل کا موضوع، مواد اور ماحول سب تصوف کے رنگ میں ہے۔ مسائل تصوف اور کلام شاعر دونوں جمع ہوجائیں تو بادہ خوار بھی مقام ولایت پر فائز نظر آتے ہیں۔ اس جدا شان کی کتاب میں اس کرامت کا ظہور اس کو الگ ہی پہچان عطا کرجاتا ہے۔ فاضل مولف کی شناخت بھی ہفت رنگ شخصیت کی ہے۔ ادیب، شاعر، ناقد، محقق، شاعر، صحافی اور خطیب کی حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ سخن فہم ہیں اور اس باب میں طرف داری کے نقص سے دور ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ روزنامہ انقلاب کے مدیر شاہد لطیف نے کسی اچھی ساعت میں ان سے ایک غزل کی تفہیم و تشریح کی فرمائش کی۔ غزل تو بس غزل ہوتی ہے۔ یہ پڑھنے اور سننے والے کے مرتبہ قبول کی بات ہے کہ مجاز کو حقیقت کے آئینہ میں دیکھنے کا سلیقہ آجائے ورنہ عارفانہ، صوفیانہ اور متصوفانہ یہ ساری تعبیریں تو کیفیتوں کے مقامات کی حدبندی کرنے والی ہیں۔ غزل واصف علی واصف کی تھی، مطلع تھا:

میں نعرۂ مستانہ میں شوخیٔ رندانہ
میں تشنہ کہاں جاؤں پی کر بھی کہاں جانا

سات اشعار کی غزل انانیت کی ست رنگی تصویر تھی۔ فاضل شارح نے شرح کی، شایع ہونے کے بعد ہل من مزید کا شور ہوا تو خواجہ میر درد سے سید امین اشرف تک بیس شعرائے متقدمین ومتاخرین کی غزلیں نظر انتخاب میں سماتی گئیں اور شارح کے پیمانہ صفاو معرفت میں ڈھلتی گئیں۔ صوفی اور متصوف کی تشریح میں شیخ علی ہجویری کے طبقات صوفیہ کی تقسیم بھی سامنے آگئی کہ ایک صاحب وصول، دوسری قسم صاحب اصول اور تیسری قسم صاحب فضول کی ہے۔ تشریح مطالب میں جب اس قسم کے نکتے سامنے آنے لگیں تو پھر غزل کی طرح اس کی شرح بھی کم جاذب، رنگین اور شوخ نہیں رہتی۔ درد، میر، مرزا جان جاناں، ولی، سراج، آتش، غالب، شیفتہ، امیر، حالی، اکبر، جوہر، اقبال، فانی، حسرت، اصغر اور جگر کی غزلوں کا حسن انتخاب اور اس میں شاہ تراب علی قلندر اور بیدم شاہ وارثی جیسے حضرات صوفیہ کے اشعار کی شمولیت نے کتاب ہی نہیں، صنف ادب کی پاکیزگی پر مہر لگادی۔ شاہ قلندر کے دل کی دنیا بدلی تو جو غزل ان کی کیفیتوں کی گواہ بنی اس کا پہلا شعر خدا جانے کیا کیا کہہ جاتا ہے کہ:

کس مبتلا کی ہائے مجھے بد دعا لگی
اس شوخ چشم سے جو مری آنکھ جالگی

بیدم شاہ وارثی، مغلوب الحال تھے یا نہیں لیکن ایک غزل نے شارح کو بہت کچھ یاد دلا دیا کہ:

نہ تو اپنے گھر میں قرار ہے نہ تری گلی میں قیام ہے
تری زلف و رخ کا فریفتہ کہیں صبح ہے کہیں شام ہے

کم ہی علم ہو گا کہ یہ شعر بھی ان ہی وارثی کا ہے کہ:

دینے والے تجھے دینا ہے تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہی داماں ہو جائے

فاضل شارح نے بھگتی کی دنیا کی سیر کی اور ٹیگور کے عالم روحانیت کی بھی سیر کرائی ہے، شاید یہی فکر و نظر کی وسعت تھی جس نے عارفانہ اشعار کی اس تشریحی بیاض میں فیض، مخدوم اور

جاں نثار اختر اور تو اور فراق کو بھی شامل کرلیا۔ ان کی تقدیمی تحریر، حرف انکسار کے عنوان سے ہے اور یہ کتاب کی لذت کو اور بھی پر لطف بنا دیتی ہے۔ حالاں کہ ان کو احساس ہے کہ لذت و کیفیت کی تفہیم دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس چھوٹی کتاب نے یہ تو ظاہر کر دیا کہ بعض مشکل کام بھی کس خوبی سے ادا کیے جاسکتے ہیں۔ کتاب حسن ظاہر کی بھی شاہد ہے۔ البتہ ایک جگہ ''تنقید کے نئے مکاتیب'' نے مکاتب کی معنویت کا رخ موڑ دیا ہے۔ آیندہ طباعت میں اس کی اصلاح ضروری ہے۔ (ع۔ص)

مولانا ڈاکٹر عبدالرحمن ساجد الاعظمی، وقت کے سائے میں دنیاو آخرت، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد صفحات ۳۴۰، قیمت ۲۵۰ر روپے سن اشاعت ۲۰۲۱ء، پتہ: مکتبہ حارث، فیض نگر ادری، ضلع مئو۔ یوپی موبائل: ۸۷۶۵۹۵۹۶۹۳

وقت کیا ہے؟ اس کی حفاظت اور اس کی ذمہ داری کا احساس کیا ہے؟۔ کیا زندگی کا دوسرا نام وقت ہے؟ اس کتاب کے قریب دو سو مضامین، اسی وقت اور زندگی کو سمجھنے، اس کو کار آمد بنانے اور خیر و شر کی ابتلا و آزمائش سے سرخ رو ہو کر اپنے خالق و مالک کی بارگاہ میں حاضر ہونے یعنی انسان کی زندگی کو کامیاب بنانے کے طریقوں کے لیے خاص کیے گئے ہیں۔ نہایت آسان، دلکش اور موثر انداز بیان نے زندگی کی بڑی اور سنگین حقیقتوں کو سمجھنے اور برتنے کا پیغام دلوں تک پہنچانے میں مصنف کی کامیابی کا اعلان کر دیا ہے۔ موت اور زندگی اور حیات دائمی ہی انسان کے وجود کی اصل حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو لائق مصنف نے بڑی جامعیت اور اس سے بڑھ کر جاذبیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ بزرگوں کے احوال، اقوال اور اعمال کو جمع کر کے واقعی نفس سوختہ شام وسحر کو تازہ کر دیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنے بارے میں بھی دلچسپ تحریر قلم کے حوالے کر دی ہے۔ ان کے قلم کی شگفتگی، ہر قدم پر داد طلب ہے۔ فن خوش نویسی نے ان کو قلم کی برکت اس طرح عطا کی کہ ان کو شذرات شبلی کے تنقیدی جائزہ کا موضوع، ایم فل کے لیے مل گیا۔ جو وقت کے ایک نامور شبلی و اقبال شناس پروفیسر عبدالحق کے آستانۂ حق تک لے گیا۔ شاید اسی سفر نے ان پر وقت اور زندگی کی گرہیں کھولنے کی ہمت دی۔ یہ کتاب اسی ہمت کی داستان ہے۔ اس کا افادہ یقیناً سب کے لیے ہے۔ (ع۔ص)

محمد عرفان جون پوری، شاعری میں شہر جون پور: متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۲۷۵ روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، پتہ: محمد عرفان جون پوری، عزیزیہ لائبریری، محلہ میرمست، جون پور، یوپی ۲۲۲۰۰۱، موبائل نمبر: ۷۹۰۵۶۳۶۴۴۸

جون پور کا شہر، اپنی تاریخی عظمت و انفرادیت و قدامت کے لیے مشہور ہے، ہندوستان کی تاریخ کے سب سے باذوق بادشاہ کی زبان سے اس شہر کو فخریہ، شیراز ہند کا خطاب عطا ہوا۔ یہ خود اس شہر کی خوبی و خاصیت کا بے مثال اظہار ہے۔ جس بادشاہ کے ذہن میں تاج محل کے تصور کو باریابی نصیب ہو، اس کی زبان کو زیب تھا کہ حافظ و سعدی کے شیراز کے خیال کو لفظوں میں منتقل کرے۔ اسی لیے حسن و جمال اور رعنائی و زیبائی کے حقیقی شاہدوں یعنی شاعروں کو اس شہر خوباں کی مدح سرائی کی قدر تاً توفیق ملی۔ اب جون پور کی ادبی و شعری پہچان بلکہ عاشق کی شکل میں اس کتاب کے مرتب نے ایسے تمام شعراء کے کلام پر نظر کی جس میں جون پور کا ذکر ہو۔ منفرد انداز کی یہ محنت رنگ لائی اور زیر نظر کتاب میں پچاس سے زیادہ شاعروں کے کلام میں جونپور کو مدح و ستائش کی روشنی میں پیش کر دیا گیا۔ شاعروں کی صف میں شاہ ولی اللہ دہلوی بھی اس شعر کی نسبت سے نظر آئے کہ:

من جونفور اذا هبت رياح رضى　　منها تعطرت الدنيا وما فيها

مقدمہ اور تقدمہ میں جون پور کی مختصر تاریخ پیش کر دی گئی، حقانی القاسمی کی تقریظ بھی خوب ہے۔ اس خوبصورت ادبی کاوش کے لیے فاضل مرتب ہر طرح مستحق تبریک و تحسین ہیں۔ (ع۔ص)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، عرشی تاج پوری۔ احوال و آثار، صفحات ۱۲۸: مکتبہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، موبائل نمبر: ۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵، ای میل: azmi408@gmail.com

عرشی تاج پوری کا نام ابوالقاسم محمد فضل رب اور عرشی تخلص تھا۔ وہ علامہ شبلی نعمانی کے ہم وطن و ہم عصر تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اعظم گڑھ میں ہوئی۔ ان کو اردو و فارسی دونوں زبانوں میں شاعری و نثر نگاری میں کمال حاصل تھا۔ مہاراجہ گوالیار کے صاحب زادے کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد دکن کے دربار سے وابستہ ہوئے اور ان کے شاعر خاص ہو گئے۔ انہوں نے ندوۃ العلماء کے ابتدائی اجلاسوں میں بھی شرکت کی۔ ان کا فارسی کلام اعلیٰ پایہ کا تھا۔ ان کے بعض ہم عصروں نے ان کے کلام کو انوری، خاقانی اور قاآنی کا ہم پلّہ قرار دیا

ہے۔ مگر افسوس کہ ایسے قادرالکلام شاعر اور پختہ نثر نگار سے علمی و ادبی دنیا نے اعراض برتا اور ان کو وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ یہ کتاب اسی احساس اور اعظم گڑھ کے اس مظلوم ادیب وشاعر سے مصنّف کی بجا عقیدت کا عملی وادبی مظہر ہے۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو مسعود علی محوی پر تحقیق کے دوران عرشی صاحب کا ایک نادر کتابچہ ”کارنامۂ عبرت“ ہاتھ آیا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے ان کے مزید احوال وآثار دیدہ ریزی سے تلاش کیے لیکن ان کے بقول ان کا دامن تحقیق خالی رہا۔ بہر حال انھوں نے دستیاب مآخذ کی روشنی میں ان کے سوانحی حالات قلم بند کیے اور ان کی تمام منثور و منظوم نگارشات، ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں قوم میں تعلیمی ضروریات کے موضوع پر ان کا پیش کردہ فارسی مقالہ اور حاصل شدہ کتابچہ ”کارنامۂ عبرت“ وغیرہ کو شامل کر کے ایک مختصر اور عمدہ کتاب تیار کر دی اور اعظم گڑھ کی ایک فراموش شدہ شخصیت کے رخ سے نقاب گرد ہٹا کر علمی و ادبی منظر نامے پر پیش کیا۔

حاصل شدہ مواد کی ترتیب و تدوین کی خوش سلیقگی سے قطع نظر اس کتاب کا وہ حصہ مطالعے کے لائق اور ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی ژرف نگاہی کا بیّن ثبوت ہے جو عرشی تاج پوری کے سال وفات اور غازی پور کے ایک جلد ساز کی دکان سے ”بیاض شبلی“ کے سرقے سے متعلق ہے۔ عرشی صاحب کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے ان کا سنۂ وفات ۱۸۹۲ء تحریر کیا ہے جو ڈاکٹر صاحب کے بیان کے مطابق غلط ہے، اس لیے کہ ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۹۵ء کی روداد میں ان کی شرکت اور اس میں ایک فارسی مثنوی پیش کرنے کا ذکر ہے۔ اس سے یہ یقینی ہے کہ عرشی تاج پوری کی وفات ۱۸۹۵ء کے بعد ہوئی۔ حیات شبلی میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ ابوالقاسم عرشی کی وفات نوجوانی میں ہوئی جب کہ ڈاکٹر صاحب نے ”تذکرہ شعرائے دکن“ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا انتقال پچاسی سال کی عمر میں ہوا۔ اسی اقتباس میں ”بیاض شبلی“ کے سرقے کے متعلق ایک سنی سنائی روایت کو جگہ دے کر اس سرقے کو عرشی تاج پوری کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار اس کی پرزور تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ روایت شامل کتاب نہ ہوتی تو بہتر ہوتا (ص ۲۱)۔ عرشی تاج پوری کے دامن عزت پر ایک عرصے سے جو داغ لگا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اس کو صاف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے حسب ضرورت کتاب میں شامل فارسی منظومات اور نثری نگارشات پر مفید تعلیقات اور توضیحی نوٹس لکھے ہیں۔ اس وقت اردو دنیا کی اکثریت فارسی سے

نابلد ہے اور اس کا دائرہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آئندہ ایڈیشن میں فارسی مشتملات کا اردو ترجمہ ضروری ہے تاکہ اردوشناسوں کو عرشی فہمی میں آسانی ہو۔ اس مفید اور اپنے موضوع پر پہلی باقاعدہ تصنیف کے لیے صاحب کتاب اہل علم و ادب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ (کلیم صفات اصلاحی)

معصوم مرادآبادی (مرتب)، منشی عبدالقیوم خاں خطاط، صفحات: ۱۶۰، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۲۵ء، قیمت: ۱۲۵ روپے، فون نمبر: ۲۶۱۰۹۷۴۶۔

منشی عبدالقیوم خاں خطاط مرحوم فن کتابت سے بخوبی آشنا اور مرتب کتاب کے نانا تھے۔ وہ مرادآباد کے رہنے والے تھے، بہت ذی علم اور متعدد زبانوں میں ماہر تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ بجنور، دہلی اور کلکتہ میں گذرا۔ انہوں نے قرآن مجید اور "مدینہ" بجنور اور "برہان" دہلی جیسے مشہور زمانہ اخبار و جرائد کی کتابت کی۔ ان کو مولانا ابوالکلام آزاد کے محبوب اور کاتب خاص کی حیثیت سے شہرت ملی۔ وہ ترجمان القرآن اور غبار خاطر کی جاذب نظر کتابت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ ترجمان القرآن کی پہلی اور دوسری جلد کے دوسرے ایڈیشن کے طباعتی اخراجات میں معاونت کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ ان کے مختصر حالات پہلی بار ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مکاتیب ابوالکلام آزاد میں شائع کیے۔ ایسے صاحب کمالات شخص کے متعلق معلومات تشنہ تھیں جس کا ازالہ اس مختصر مگر جامع کتاب کے ذریعے سے کیا گیا ہے۔

کتاب کا مقدمہ احمد سعید ملیح آبادی نے لکھا ہے جس میں ترجمان القرآن کی تیسری جلد کے قضیے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد کے کلکتہ والے مکان، جس میں منشی عبدالقیوم خاں مقیم تھے کو قومی یادگار بنانے کی تجویز احمد سعید صاحب نے پیش کی تھی، منظور ہوئی۔ "مولانا آزاد کی سوانح حیات کا ایک نیا حوالہ" کے عنوان سے ایک شگفتہ ادبی تحریر پروفیسر محسن عثمانی کے نوک قلم سے چھلکی ہے۔ اس کے بعد مرتب نے "مولانا آزاد کی رفاقت" کے عنوان سے مولانا آزاد کی بارگاہ میں اپنے نانا کی باریابی، ان سے تعلق کی نوعیت، ابتدائی حالات اور شخصی کمالات وخصائص اور وفات وغیرہ کے باب میں دلچسپ، محققانہ اور بعض نادر معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا علم بہت کم ہی لوگوں کو ہوگا کہ جب مرزا صغیر بیگ کو مصطفی کمال پاشا کے قتل کی سازش میں شہید کیا گیا تو مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک رسالے میں ان پر ایک مضمون لکھا۔ بیگ صاحب سے خاص تعلق ہونے کی وجہ سے ان کے شخصی احوال ان کو منشی عبدالقیوم خطاط

مرحوم نے فراہم کیے تھے۔

کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب منشی عبدالقیوم صاحب کی تحریروں پر مشتمل ہے جن کو مرتب نے اپنے عمرے کے سفر کے دوران مدینہ منورہ میں مقیم ان کے پوتے سے حاصل کیا۔ ان کے مطابق ان میں سب سے اہم وہ مضمون ہے جس میں منشی صاحب نے مولانا آزاد کی مفلسی کی تفصیل بیان کی ہے جس پر اب تک کسی محقق نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ دوسرا باب "مکتوبات آزاد" ہے جس میں منشی صاحب کے نام مولانا آزاد کے چودہ مطبوعہ خطوط ہیں۔ مرتب نے ان کی دلچسپ طباعتی تفصیلات بھی نقل کی ہیں۔ باب سوم "خراج عقیدت" کے تحت منشی عبدالقیوم صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادوں اور بعض اہل قلم بشمول مالک رام کی جو وفیاتی یا ان سے متعلق کوئی تحریر اخبارات ورسائل یا جہاں سے دستیاب ہوئی جمع کی گئی ہیں۔ باب چہارم میں منشی صاحب کے بڑے بیٹے محمد عبدالملک جامعی کے نام کل ۳۰ خطوط ہیں جن کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ذاتی احوال کے ساتھ تقسیم ہند کے دردانگیز حالات کا عکس بھی ان میں موجود ہے۔ ماہر ابوالکلامیات ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، منشی عبدالقیوم خاں کے بھی مرتبہ شناس اور خود مرتب سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔ آخری مقالہ ان ہی کی یاد میں بجاطور پر شامل کتاب ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق بعض نئی معلومات بھی ہیں۔ اس کے بعد منشی جی کی کتابت کے عکسی نمونوں میں مدینہ پریس بجنور سے شائع شدہ ترجمۂ قرآن کا ایک ورق، تذکرہ اور غبار خاطر وغیرہ کا سرورق دیا گیا ہے۔

مرتب معروف صحافی ہیں جنہوں نے اس سے پہلے "اردو صحافت اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" اور "اردو صحافت کا ارتقاء" نامی کتاب لکھ کر بزم صحافت میں نام و مقام پایا۔ قومی و بین الاقوامی سیاست اور علمی، ادبی اور ملی مسائل و موضوعات پر ان کے خیالات وافکار اور اسلوب میں بڑی متانت و سنجیدگی ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اردو صحافت کی آبرو سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی بے باک صحافت موجودہ ضمیر فروش صحافیوں کے لیے یقیناً قابل تقلید ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے منشی عبدالقیوم خطاط مرحوم کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد کی زندگی کے کئی پہلوؤں کی طرف پہلی بار توجہ دلائی۔ ان کے علاوہ متعدد اشخاص واعلام کی حیات نیک نام کے جلوے بھی بکھیرے ہیں۔ توقع ہے کہ علمی وصحافتی حلقوں میں یہ کتاب مقبول ہوگی۔ (ک۔ص اصلاحی)

ادبیات

نعت پاک ﷺ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

گوشۂ مطالعاتِ نعت، علی گڑھ، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

حمدِ خدا لبوں پہ ہو، آقا کا نام بھی
اے کاش یوں کٹے مری ہر صبح، شام بھی

اب دیکھنے کو کیا بچا، جب دیکھ آئے ہم
کعبہ بھی اور روضۂ خیر الانام بھی

وہ انبساطِ روح، ضیا بار وہ فضا
دنیا سے مختلف وہ سحر بھی تھی، شام بھی

آنکھوں کے ساتھ دل بھی تھا محوِ تجلیات
دیدارِ خاص تھا، وہاں دیدارِ عام بھی

ہر ایک شے اصول کی پابند تھی وہاں
خوش دیدنی وہاں کا تھا سارا نظام بھی

کعبے کا ہو طواف کہ مسعیٰ کے مرحلے
بے ذکرِ رب کے اٹھتا نہ تھا ایک گام بھی

مزدلفہ کا قیام، وہ عرفات کا وقوف
اب تک ہیں یاد ہم کو منیٰ کے خیام بھی

پیتے تھے جوق جوق مناھل پہ جن کو لوگ
تھے کس قدر لذیذ وہ زمزم کے جام بھی

جس کو نصیب کعبہ وطیبہ کی ہو، ہوا
مسرور دل ہو اور معطر مشام بھی

آقا کی رفعتوں کی کوئی انتہا نہیں
ہے ختم ان کی ذات پہ ہر احترام بھی

معراج ، یعنی عالم بالا کا وہ سفر
جس دم ٹھہر گیا تھا جہاں کا نظام بھی

بچنے کی اپنے فکر کرو، اہل جور سے
مثلِ جہاد ہی ہے عزیزو! یہ کام بھی

سوچو کبھی کہ ایسے بھی لیل و نہار تھے
تھی تیغ بھی ہماری، ہماری نیام بھی

اے کاش پھر قیام مدینے کا ہو نصیب
پھر سامنے ہو عتبۂ بیت الحرام بھی

پھر روح کو سرور میسر ہو ہر گھڑی
اور دل کو ہو نصیب نشاطِ تمام بھی

آقا سے جاکے کوئی کہے، اے شہِ انام
ہے ہند میں رئیس اک ادنیٰ غلام بھی

غزل

وارث ریاضی
کاشانۂ ادب سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا: لوریا مغربی چمپارن۔ بہار
موبائل نمبر: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

(اسی غزل کی زمین میں حضرت اصغر گونڈوی کی غزل سے متاثر ہو کر)

خدا جانے کہاں ہے ساقیٔ میخانہ برسوں سے؟
نہیں آئے لبوں تک ساغر و پیمانہ برسوں سے
جہاں سے اٹھ گئی رسم و رہِ وارفتگی شاید
دکھائی ہی نہیں دیتا کوئی دیوانہ برسوں سے
نہ دیکھی قیس کی صورت، نہ لیلیٰ ہی نظر آئی
مگر سنتا ہوں ان کے عشق کا افسانہ برسوں سے
یہ کیسی سوچ ہے؟ وہ درسِ علم و آگہی دے گا
حواس و ہوش کھو بیٹھا ہو جو فرزانہ برسوں سے
خدا کی ذات پر کامل یقیں رکھتا ہوں میں دل سے
مگر پھر بھی ہے محکم رشتۂ بت خانہ برسوں سے
لبوں پر ہے مرے جاری، خدائے واحد و برحق!
تری وحدانیت کا نغمۂ مستانہ برسوں سے
معاذاللہ یہ رسوائیاں شمعِ محبت کی
کہ مر مٹتا نہیں اس پر کوئی پروانہ برسوں سے
زمانہ جانتا ہے مجرم مہر و وفا میں ہوں
خلوصِ عشق کا دیتا ہوں میں جرمانہ برسوں سے
خدا کا فضل ہے کہ امتِ خیرالبشرؐ میں ہوں
دلِ پر شوق ہے وارثؔ تجلی خانہ برسوں سے

رسید کتب موصولہ

پروفیسر مجید بیدار، **اردو مضمون نگاری فن اور تاریخ:** ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹر، پرانی حویلی، حیدرآباد، صفحات:۲۷۹، سالِ اشاعت:۲۰۲۳ء، قیمت:۳۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۴۴۱۶۹۷۰۷۲

ڈاکٹر سید عبدالرشید، **بیت الحکمت:** قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نظام الدین، نئی دہلی، صفحات: ۳۹۴، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۴۶۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۱۵۱۷۷۳۹۹

قاضی ابواللیث شاہ محمد غضنفر علی قریشی قادری اسد ثنائی، **تذکرۂ سراج المجذوبین حضرت سید خواجہ حسن برہنہ شاہ:** مکتبہ الانصار، جمال کالونی، ریاست نگر، حیدرآباد، صفحات:۱۴۵، سالِ اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت:۱۵۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۹۱۳۰۱۱۹۲

مفتی فیضان رضا مرکزی، **تعریفات رضویہ:** ادارہ ضیاء البرہان دارالسلام، جبل پور، مدھیہ پردیش، صفحات:۱۶۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۵ء، قیمت:۱۵۰روپے، موبائل نمبر: درج نہیں

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی، ***The Noble Qur'an*:** اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، لکھنؤ، صفحات : ۱۵۰، سالِ اشاعت : ۲۰۲۵ء، قیمت : ۱۵۰روپے، فون نمبر: ۵۲۲-۲۷۴۱۵۳۹

مفتی احمد اللہ نثار قاسمی، **رمضان المبارک معروفات و منکرات:** دارالعلوم رشیدیہ مہدی پٹنم، حیدرآباد، صفحات:۷۰۹، سالِ اشاعت:۲۰۲۲ء، قیمت:۶۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۴۴۰۰۷۸۹۵۶

راشد حسن مبارک پوری، **شیخ الکل میاں سید محمد نذیر حسین محدث دہلویؒ حیات وخدمات** (جلد اول): مسجد محتسب، پھاٹک حبش خاں، تلک بازار، دہلی، صفحات:۷۵۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت و موبائل نمبر درج نہیں۔

ڈاکٹر نزار العانی، ڈاکٹر مفتی محمد شاہ جہاں ندوی (مترجم)، **فکر اسلامی میں انسانی شخصیت:** ایفا پبلی کیشنز، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات:۳۴۵، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت : درج نہیں، فون نمبر:۰۱۱-۲۶۹۸۱۷۷۹

شیخ اسعد اعظمی، **تاریخ وتعارف مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی:** مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی، صفحات:۳۵۲، سالِ اشاعت:۲۰۲۳ء، قیمت:۶۰۰روپے، موبائل نمبر:۹۳۳۶۰۱۰۲۲۴

حکیم فخر عالم، **یونانی طب میں تاریخ قرابادین نویسی:** ثمرین اپارٹمنٹ، شاہ بشیر کالونی، ہادی نگر، دوہرہ معافی، علی گڑھ، صفحات:۲۸۸، سالِ اشاعت:۲۰۲۶ء، قیمت:۶۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۱۶۵۳۰۴۱

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم ومصر وشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول // //	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم // //	--
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

AUG 2026 Vol- 213(8) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF **AZM/NP- 43/2026-28**

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سو سال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay PhonePe Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام خان (ڈائرکٹر)